Digitized By eGangotri
میزان
ڈاکٹر پریمی رومانی

☆ پریمی رومانی کے اسلوب میں ایک خاص قسم کی شگفتگی ہے' جو اس لیے بھی تعجب خیز ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ اُن کا قدم خوب سے خوب تر کی جانب اُٹھ رہا ہے۔ اگر وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے اور اپنے مخصوص میدانِ تنقید یعنی جدید اُردو شاعری سے باہر نہ بھٹکے تو یقیناً کچھ عرصہ کے بعد اُردو ادب میں اُن کی آواز غور سے سُنی جائے گی۔

(پروفیسر مسعود حسین خان' علی گڑھ)

☆ ڈاکٹر پریمی رومانی ادھر نئے لکھنے والوں میں خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جدید اُردو شاعری، چند مطالعے، اوراق، ردِّ عمل، تاثرات، برج پریمی۔ ایک مطالعہ نیز شاعری میں سنگِ میل اور ان کے علاوہ کشمیری میں دو کتابیں۔ اُنھوں نے تحقیق وتنقید دونوں سمت توجہ دی ہے اور دونوں کا حق ادا کیا ہے......... ڈاکٹر پریمی رومانی کے مطالعے کی وسعت اور شعروادب کے مختلف گوشوں پر اُن کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

(پروفیسر سلیماں اطہر جاوید (حیدرآباد)

ماہنامہ سب رس' حیدرآباد اگست ۲۰۰۳ء)

Printed at: JK Offset Printers, Delhi-6
Ph. 23279852, M [illegible]

ڈاکٹر پریمی رومانی

# میزان

MEEZAN

(Criticism & Research) 2006

By Dr. Premi Romani Rs.150

TAPAS!YA 1/3 Naseeb Nagar, Janipur, Jammu.180007 (Tawi)

برادرم مسلم صاحب
بے پناہ خلوص
کے ساتھ
۲۵/۲/۰
احقر
پریمی رومانی
۱۸ فروری ۲۰۰۶ء
۳/۱ نصیب نگر - جانی پور
جموں ۱۸۰۰۰
(توی)

# ڈاکٹر پریمی رومانی

سالِ اشاعت 2006

مصنف کا نام ڈاکٹر پریمی رومانی

مصنف کا پتہ 1/3 Naseeb Nagar

Janipur, Jammu.180007

قیمت ڈیڑھ سو روپے/Rs.150

کمپیوٹر کمپوزر دلیپ کمار شرما، بوٹا نگر پلوڑہ، جموں

☆ رچنا ایمہ نے

جے کے آفسیٹ پریس، دہلی سے چھپوا کر

رچنا پبلی کیشنز جموں (توی) سے شائع کی

تقسیم کار:

☆ ادارۂ ادبیاتِ اُردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد 500082

☆ سٹار پبلی کیشنز، آصف علی روڈ، نئی دہلی 110002

☆ انجمن ترقی اُردو (ہند) اُردو گھر، راوز ایونیو، نئی دہلی 110002

☆ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی۔110006

☆ رچنا پبلی کیشنز ۳/۱ نصیب نگر، جانی پورہ، جموں 180007

☆ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولہ مارکیٹ، دریا گنج دہلی 110006

# اِنتساب

عزیز دوست

ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی

کے نام

ڈاکٹر پریمی رومانی

# ترتیب

# اپنی بات

''میزان'' مختلف اوقات پر لکھے گئے اُردو کی بعض دِلچسپ کتابوں پر میرے تبصروں اور جائزوں کا مجموعہ ہے۔

یہ تبصرے اور جائزے وقتاً فوقتاً ہندوپاک کے مقتدر رسایل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے جا چکے ہیں۔ ان میں سے بعض تبصرے مختلف علمی وادبی انجمنوں کے زیرِ اہتمام منعقد کیے گئے سیمیناروں میں پیش کیے گئے جن کی نہ صرف باذوق قارئین نے داد دی بلکہ اُردو کے بعض عالموں اور دانشوروں نے بھی اپنے ذرین خیالات سے نوازا، جن سے میں نے راہ اور روشنی پائی۔

۱۹۹۷ء میں میرے تنقیدی اور تحقیقی مقالات کا مجموعہ ''تاثرات'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بھی اُردو زبان وادب کی مختلف کتابوں پر میرے بعض اہم تبصرے شامل ہو چکے ہیں۔ ان تبصروں کو بھی اہلِ فن نے بے حد سراہا۔ چنانچہ مجھے مختلف عالموں، فاضلوں اور دانشوروں کی طرف سے متعدد حوصلہ افزا مکتوبات موصول ہوئے۔ اُردو زبان کے معروف محقق، نقاد اور شاعر پروفیسر عنوان چشتی (مرحوم) سابقہ صدر شعبہ اُردو جامعہ ملیہ، دہلی نے مجھے اپنے ایک حوصلہ افزا مکتوب میں لکھا:

''تاثرات میں اگرچہ تنقیدی مقالوں کے ساتھ ساتھ کتابوں

> کے تبصرے بھی شامل ہیں مگر تبصروں میں بھی وہی تنقیدی نگاہ
> جلوہ فرما ہے جو اُن (آپ) کے مقالوں میں ہے۔ اس لیے
> اُن (آپ) کے تبصرے بھی مقالوں کی طرح تنقیدی بصیرت
> کے حامل ہوتے ہیں۔''

اس اقتباس سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ میں نے ''میزان'' میں شامل ہر ایک کتاب کا کتنے خلوصِ دل اور دیانتداری سے مطالعہ کیا ہے۔

نئی کتابوں پر تبصروں کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر میری یہ کاوش آپ کو پسند آجائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ میں اپنے قارئین پر یہ ذمہ داری عائد کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ میری ان اُلٹی سیدھی تحریروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی زحمت کریں۔ میں ہمیشہ اُن کے زرین مشوروں کا بے چینی سے انتظار کرتا رہوں گا۔

آخر میں، میں اپنے عزیز دوست دلیپ کمار شرما کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور لے آوٹ تیار کرنے میں میری مدد کی۔

۲۷/اکتوبر ۲۰۰۵ء

ڈاکٹر پریمی رومانی
تپسیا ۳/انصیب نگر، پمپوش کالونی
جانی پورہ، جموں (توی)۔۱۸۰۰۰۷

# اقبال اور مشاہیرِ کشمیر

کلیم اختر

کلیم اختر نہ صرف اردو کے ایک ممتاز ادیب ہیں بلکہ وہ ایک قابل قدر صحافی اور مورخ کی حیثیت سے بھی جانے اور پہچانے جاتے ہیں ۔ وہ اقبالیات کے موضوع سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں اور کشمیریات کے موضوع پر بھی وقتاً فوقتاً خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں اوراس طرح سے ایک عرصہ سے اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کرتے آئے ہیں ۔

کلیم اختر خطہ جموں میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم جموں اور سرینگر کی درس گاہوں سے حاصل کی ۔ بعد میں ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے یہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے کا شغل برقرار رکھا لیکن اپنے وطن مالوف کی یاد انہیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتی رہی ۔ چنانچہ کشمیریات اور اقبالیات کے موضوعات پر ان کا کام بنیادی حیثیت کا حامل ہے ۔ ان کی تازہ ترین تصنیف ''اقبال اور مشاہیر کشمیر'' اپنے وطن مالوف کشمیر کے تئیں ان کے سچے جذبے اور والہانہ عقیدت کا نتیجہ ہے ۔ 352 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا دیباچہ ماہر اقبالیات ڈاکٹر وحید عشرت نے لکھا ہے ۔ جو اقبال اکادمی لاہور کے ایک اہم عہدداری حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں اور گلشن پبلشرز سری نگر نے

بڑے اہتمام سے یہ کتاب شایع کی ہے۔

اقبالیات کے موضوع پر نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ادب تخلیق ہو چکا ہے۔اور بے شمار ایسی تصانیف منظر عام پر آ گئی ہیں جن میں اقبال کے فکر وفن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان میں سے بعض تصانیف قابل مطالعہ ہیں اور فکر کے نئے دروازے وا کرتی ہیں۔کلیم اختر کی تصنیف اقبال اور مشاہیر کشمیر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اقبال اور کشمیر کے حوالے سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصانیف کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ان تصانیف میں بھی اقبال اور مشاہیر کشمیر کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم ہوتی ہیں۔لیکن کلیم اختر کی تصنیف اس موضوع پر تفصیلی جائزہ پیش کرتی ہے۔اس تصنیف میں نہ صرف بزرگان دین کے تیئں والہانہ عقیدت کا اظہار انہوں نے کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال اپنے کلام و پیام میں ان بزرگان دین کے تیئں کس طرح سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ انہوں نے بعض اہم مشاہیر کشمیر کا جائزہ بھی بڑے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے اس کتاب کے بارے میں کلیم اختر خود رقمطراز ہیں:۔

> ''اقبال اور مشاہیرِ کشمیر'' میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے ریاست جموں وکشمیر کی ان شخصیتوں پر لکھے جنہیں علامہ محمد اقبال کی قربت کا شرف حاصل ہے اور ان کشمیری نژاد عاشقان اقبال پر بھی خامہ فرسائی کی جن کی علامہ محمد اقبال سے عقیدت وارادت کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ان میں ایسے مضامیں بھی ہیں جنہیں رجال اقبال کہا جاتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو تحریک حریت کشمیر میں علامہ اقبال کے کردار اور خدمات جلیلہ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔''

درج بالا اقتباس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ کلیم اختر کی علامہ اقبال سے کس قدر عقیدت اور ریاست جموں وکشمیر سے لگاؤ ہے۔زیر تبصرہ کتاب میں جن اہم مشاہیر کشمیر کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی شاہ ہمدان، شیخ نورالدین

نندرشی جیسے بزرگان دین، غنی کاشمیری، مولانا انور شاہ کشمیری، مہجور کاشمری، چودھری خوشی محمد ناظر، خواجہ عبدالصمد ککرو، خلیفہ عبدالحکیم، رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تاثیر، صاحبزادہ محمد عمر، منشی سراج الدین احمد، میاں امیر الدین اور شیخ محمد عبداللہ جیسے دانشور اور سیاست دان شامل ہیں۔

ان کے علاوہ کشمیراور اقبال، علامہ اقبال کا سفر کشمیر، علامہ محمد اقبال اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی، علامہ اقبال اور دوسری گول میز کانفرنس وتحریک کشمیر، علامہ اقبال کے خطوط کشمیری مشاہیر کے نام، اقبالیات کا کشمیری مترجم سید غلام قادر اندرابی اور شعرائے کشمیر کا علامہ اقبال کوخراج عقیدت جیسے دلچسپ وفکر انگیز موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اور بقول ڈاکٹر وحید عشرت، کلیم اختر کو اقبال اور کشمیر سے جو عشق ہے یہ کتاب اس کا خوبصورت عکس، کتاب کا ڈسٹ کور، دیدہ زیب اور طباعت اچھی ہے۔ قیمت -/500 روپے ہے جو آج کل کی گراں بازاری میں عام پڑھنے والوں کے لئے اتنی مہنگی کتابیں خریدنا مشکل مرحلہ ہے۔ البتہ لائبریریوں کی تحویل میں کتابوں کو خریدنے کے لئے معقول رقم ہوتی ہے جو آسانی سے ایسی کتابیں خرید سکتی ہیں۔ تاکہ عام قاری اتنی دلچسپ اور مفید کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

# پیامِ اقبال

## محمد بدیع الزماں

جناب محمد بدیع الزماں اُردو ادب کے ایک حساس، دردمند اور باشعور فن کار ہیں۔ وہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ''پیامِ اقبال'' اُن کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں علامہ اقبال کے فکروفن پر بڑے فِکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے چند مضامین ایسے ہیں جن پر مختلف نقادوں نے بار بار خامہ فرسائی کی ہے۔ اقبال کا تصورِ خودی، اقبال اور معاملاتِ حسن و عشق، اقبال اور وطنیت، اقبال اور تصوف، اور اقبال کا شاہین وغیرہ جیسے موضوعات پر رسائل و جرائد میں کافی گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن جہاں تک اقبال کا ساقی، اقبال کی تشبیہات و استعارات، اقبال کے کلام میں مصوری و پیکر تراشی، اقبال کے ذہن میں خواتین کا درجہ وغیرہ جیسے موضوعات کا تعلق ہے ان میں فکروفن کے نئے سانچے جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان موضوعات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زماںؔ صاحب نے اقبال کے فن اور فکر سے متعلق کچھ نئے سوالات اُبھارے ہیں۔ جناب جگن ناتھ آزادؔ اس کتاب کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں:

> ''جناب بدیع الزماں صاحب نے اقبالؔ کا گہری نظر سے
> مطالعہ کرکے یہ کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ ان کی ہر بات سے

اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن ان کی محبت ہر اعتبار سے داد کے
قابل ہے۔''

جناب بدیع الزماں نے اقبآل کے حالات و واقعات جمع کرنے میں جس محنت، دیدہ ریزی اور لگن سے کام کیا ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے اقبآل کے کلام کے محاسن کے ساتھ ساتھ معائب کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس لحاظ سے ان کا یہ کام نہایت ہی قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے اقبآل کے فکر وفن کو اپنے ذہن کے سانچے میں ہی ڈھال کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف دوسروں کے حوالہ جات اور حواشی کا سہارا نہیں لیا ہے۔ بلکہ خود اپنی کاوش سے اقبآل کے کلام کا مطالعہ کر کے اس کی تہہ تک جانے کی کوشش کی ہے۔

بدیع الزماں صاحب کا طرزِ تحریر بھی قابلِ قدر ہے۔ وہ نہ زیادہ مشکل اور ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں اور نہ بوجھل تراکیب سے کام لیتے ہیں بلکہ سلیس، رواں دواں اور خوب صورت الفاظ سے بات کو سمجھاتے ہیں اور یہ اُن کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ امید ہے کہ ادب نواز حلقوں خاص کر ''اقبال نوازوں'' اور ''اقبال شناسوں'' میں زماں صاحب کی اس کاوش کو سراہا جائے گا۔

کتاب گٹ اَپ کے لحاظ سے عمدہ ہے اور اس کی قیمت بھی مناسب ہے۔ یہ مجموعہ بہار اُردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

(ماہنامہ شیرازہ جلد ۲۶ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۸۷)

# اقبالیاتِ آزاد۔ایک جائزہ

ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی

ڈاکٹر محمد اَسد اللہ وانؔی کا نام ریاست جموں و کشمیر کے نئے لکھنے والوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جموں و کشمیر کلچرا کادمی میں ملازم ہوگئے۔ یہاں اُنھیں نہ صرف اکادمی کی جانب سے شائع ہونے والے اُردو ماہنامہ ''شیرازہ''، ''ہمارا ادب'' (سالنامہ) اور ''اکادمی'' (خبرنامہ) میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع فراہم ہوا بلکہ اُنھوں نے خود بھی بڑے اچھے اور سنجیدہ موضوعات پر مضامین لکھے، جو علمی، ادبی اور تاریخی نوعیت کے ہیں۔ وانؔی نے جموں و کشمیر کے بعض بزرگانِ دین کی پاکیزہ سیرت اور اُن کی خدمات پر بھی دِلچسپ مضامین لکھے اور ریاست کے پچھڑے اور دُور اُفتادہ مقام ضلع ڈوڈہ اور کشتواڑ کے اَدبی، ثقافتی اور یہاں کے تہذیبی وِرثے پر بھی بعض فکر انگیز مقالات قلم بند کیے ہیں، جو قابلِ مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر وانؔی نثر و نظم دونوں اَصناف میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ وہ افسانے بھی لکھتے ہیں اور شعر و شاعری میں بھی گہری دِلچسپی رکھتے ہیں۔ مختلف علی و اَدبی تصانیف پر اُن کے کئی تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں اور اِنشائیہ نگاری میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن تنقید و تحقیق سے اُن کی گہری دِلچسپی ہے۔ ''شیخ العالم۔ایک مطالعہ'' اُن کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ یہ تصنیف کشمیر کے ایک بزرگ، صوفی، رِشی اور شاعر حضرت شیخ نورالدین نورانی'' کی حیات اور شاعری کا احاطہ کرتی ہے اور ۱۹۹۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے اُنھیں ۱۹۹۴ء میں اعزاز سے نوازا گیا۔

اس کے علاوہ اُنھوں نے جموں وکشمیر میں گوجری زبان واَدب، ریشی نامہ ملابہاٗ الدین متو (فارسی)، محفل اقبال، ریشیات شمس العارفین، ششگر ان کا گیت' وغیرہ جیسے مختلف النوع علمی واَدبی موضوعات پر کتابیں تالیف کی ہیں، جن کی اہمیت مسلم ہے۔ کشمیریات اور اقبالیات' وانی کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان دو موضوعات سے اُن کی شروع سے ہی دِلچسپی رہی ہے۔ اس دِلچسپی کو اور بھی تقویت بخشنے میں ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ کا زبردست ہاتھ رہا ہے، جن کی سرپرستی میں وانؔی کو'' اقبالؔ اور ریاست جموں وکشمیر کا اَدب'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا موقع فراہم ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ'' اِقبالیاتِ آزادؔ'' ڈاکٹر وانؔی کے اسی تحقیقی کارنامے کی ایک کڑی ہے، جس کو اُنھوں نے ترمیم واضافہ کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ چند برس قبل پاکستان سے جعفر بلوچ کی کتاب'' اِقبالیاتِ اسد ملتانی'' شائع ہو چکی ہے، جو اِسی نوعیت کا کام ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔ لیکن'' اِقبالیات آزادؔ'' میں وانی کا خلوص جگہ جگہ عیاں ہے۔ وانؔی کی اِس کتاب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جہاں علاّمہ اقبالؔ کے شعر ونثر کا بغور مطالعہ کیا ہے وہاں آزادؔ صاحب کی تخلیقات کو بھی سمجھا اور پھر اقبالؔ کے حوالے سے جانچا اور پرکھا ہے۔

کتاب کے عنوانات کچھ اِس طرح ہیں:-

دیباچہ، حرفِ آغاز، جگن ناتھ آزادؔ - ماہ وسال کے آئینے میں، آزادؔ کی شاعری پر اقبالؔ کے اثرات، آزادؔ کی نثر میں اِقبالیات، اقبالؔ نمائش سری نگر، جگن ناتھ آزادؔ سے بات چیت، اقبالیات۔ جگن ناتھ آزادؔ سے گفتگو اور آزادؔ کا اِقبالیاتی اَدب۔ ''اقبالیاتِ آزادؔ'' کا دیباچہ پروفیسر محمد ایوب واقف نے لکھا ہے جو علاّمہ اقبالؔ کے عاشق اور آزادؔ صاحب کے مداح ہیں۔ دَراصل یہ کتاب کے لیے لکھا گیا دیباچہ نہیں ہے، بلکہ ایک مقالہ ہے جو موصوف نے کشمیر یونیورسٹی کے اِقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد کیے گئے اقبالؔ سمینار کے لیے لکھا تھا۔ لیکن وہ اس سمینار میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ لہٰذا اُس دیباچے میں وانؔی صاحب کی کتاب'' اِقبالیات آزادؔ'' پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُس میں اِقبالیات پر آزادؔ کے کام کا خاصہ ذِکر موجود ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبالیات کے تعلق سے آزادؔ پر اِس وقت تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اِس لحاظ سے وانؔی کی یہ کوشش مستحسن ہے۔ ڈاکٹر وانؔی حرفِ آغاز

میں اقبالیاتِ آزاد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''اقبالیاتِ آزاد پیشِ خدمت ہے۔ چند مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ اقبال اور اقبالیات سے متعلق پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تخلیقی اور تحقیقی کارگزاری کا ایک اجمالی تجزیہ ہے۔ آزاد، اقبال کی شاعری، اُن کے پیغام اور فکر وفلسفہ سے کافی متاثر ہیں۔ جس کا اظہار نہ صرف اُن کی شاعری میں ملتا ہے بلکہ اُن کی تحقیقی اور تنقیدی کتب بھی اِس امر کی آئینہ دار ہیں۔''

''حرفِ آغاز'' اِس لیے بھی قابلِ مطالعہ ہے کہ اس میں وانی نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے کشمیر کے ساتھ ایک ادیب، ایک آفیسر اور ایک پروفیسر کی حیثیت سے تعلق پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور آزاد کے اُس تحقیقی کام کا جائزہ لیا ہے جو اُنھوں نے جموں و کشمیر کے قیام کے دوران سرانجام دیا ہے۔ اِس طرح سے اُن کے اقبال کے ساتھ ساتھ جموں و کشمیر سے والہانہ عشق کی بھی بھرپور جھلک سامنے آتی ہے۔

''جگن ناتھ آزاد - ماہ وسال کے آئینے میں''، ''اقبالیات آزاد'' کا دُوسرا باب ہے۔ جس میں آزاد کی توقیت، اُن کی تصانیف وتالیفات کا ذِکر، ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اُن کے توسیعی اور خصوصی خطبات، ہندوستان اور باہر کے ممالک میں علمی اور اَدبی اِداروں اور یونیورسٹیوں کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمناروں میں پیش کیے گئے آزاد کے تحقیقی وتنقیدی مقالات کی بھرپور تفصیل، بیرونی ممالک میں براڈکاسٹ اور ٹیلی کاسٹ پروگراموں کی تفصیل، علمی اور اَدبی اداروں اور انجمنوں کی رُکنیت کا جائزہ اور آزاد کی مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں اور اُن کو مختلف اِداروں کی طرف سے پیش کیے گئے انعامات واعزازات کی تفصیل کا بھرپور جائزہ ملتا ہے۔ کتاب کا یہ باب پروفیسر آزاد کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

''آزاد کی شاعری پر اقبال کے اثرات'' اور'' آزاد کی نثر میں مطالعہ اقبالیات'' اقبالیاتِ آزاد کے دو اہم حصے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر آزاد اَدب کے دونوں شعبوں نظم ونثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اِن دونوں جملہ اصناف میں وہ طبیعت آزما چکے ہیں۔ اقبال اُن کا محبوب موضوع رہا ہے۔ اِس موضوع کے ساتھ اُن کی بے پناہ محبت اور دِلچسپی کا بیّن ثبوت اُن کی شاعری کے علاوہ اُن کے

بے شمار تحقیقی وتنقیدی مجموعے ہیں۔ اُن میں آزاد نے اقبال کی شخصیت اور شاعری کو نئے زاویے سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اقبال کے کلام اور اُن کی تحریروں کا آزاد نے نہ صرف گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ اِقبالیات سے متعلق جس قدر انھیں مواد دستیاب ہوسکا ہے اُس پر بھی اُن کی نظر ہے۔ واؔنی نے ''اقبالیاتِ آزاد'' میں آزاد کی شاعری اور اُن کی نثر پر اِقبالیات کے اثرات کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ البتہ مثالوں کے طور پر اقبال اور آزاد کے اشعار پر اشعار پیش کیے ہیں، جو خاص طور پر ''آزاد کی شاعری پر اقبال کے اثرات'' کے باب میں بے جا طوالت کا باعث بن گئے ہیں۔

''اقبال نمائش سری نگر'' کا جائزہ بھی واؔنی نے نہایت ہی دِل نشیں انداز سے پیش کیا ہے، جو آزاد کی اَن تھک محنت اور لگن کا نتیجہ تھی، جس میں واؔنی کے بیان کے مطابق اقبال کی ۶۵۷ رتصاویر رکھی گئیں۔ جن کی تحقیق، اِنتخاب اور ترتیب خود آزاد صاحب نے بقدر احسن انجام دی تھی۔ یہ نمائش ملک کے مختلف حصّوں کے علمی و ادبی مراکز میں بھی منعقد ہوئی اور ایک تخمینے کے مطابق تقریباً تین لاکھ لوگ اُس نمائش سے محظوظ ہوئے۔

''جگن ناتھ آزاد سے بات چیت'' بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ یہ آزاد صاحب کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں کو سامنے لاتی ہے۔ بقول واؔنی یہ انٹرویو ایک اعتبار سے اُس انٹرویو سے قطعی مختلف ہے جو کسی سہانی پُر بہار صبح، رِم جھم بارش یا اَبر آلود شام کو لیا گیا۔ ''اقبالیاتِ آزاد کا آخری حصہ ''آزاد کا اِقبالیاتی اَدب'' ہے۔ یہ حصّہ اِس لحاظ سے اہم ہے کہ اِس میں آزاد کے اقبالیات کے موضوع پر لکھے گئے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے اقبالیاتی اَدب کا اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔

''اقبالیاتِ آزاد'' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے اقبالیاتی ادب پر ایک انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد اسداللہ واؔنی کی بے پناہ محنت اور لگن کا نتیجہ ہے، جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ۲۰۳ صفحات پر مشتمل اِس کتاب کو محروم میموریل لٹریری سوسائٹی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کر کے اُردو والوں کو ایک گراں قدر تحفہ پیش کیا ہے۔

# مفتاحِ اقبال

عبداللہ خاور

عبداللہ خاور ایک باصلاحیت اشاریہ نگار ہیں۔ اُردو ادب سے متعلق اُن کے اب تک کئی اشاریے مختلف معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ''مفتاحِ اقبال'' کے عنوان سے حال ہی میں علامہ اقبالؔ کی شخصیت اور اُن کے فن سے متعلق مضامین کا موضوعاتی اشاریہ مُرتب کر چکے ہیں، جو اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی نے بڑے اہتمام کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

موضوعاتی اشاریہ مُرتب کرنا ایک فن ہے۔ ڈاکٹر برجؔ پریمی تحقیق کو ایک مستند صحیفہ قرار دیتے ہیں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اشاریہ نمبر کی اپنی افادیت ہے۔ تحقیق کے اعتبار سے یہ ایک مستند صحیفہ ہے۔ عام قاری کے لیے اس کی اہمیت نہ ہو لیکن وہ تاریکیوں میں ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہیں تاکہ علوم کے دفینے کھوج نکالیں، وہی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔''[1]

شاعری افسانے اور مختلف موضوعات پر مضامین یوں تو آئے دن رسائل واخبارات میں

---

[1] ماہنامہ سیارہ لاہور اشاعت خاص ۲۷ سالنامہ ۱۹۸۹ء جلد ۵۵ شمارہ ۵ ص ۴۷۵

کثرت سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔لیکن اشاریہ سازی کی طرف بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔ اِس لحاظ سے اقبالؔ اکادمی پاکستان کی کوششیں قابلِ ستائش ہیں جو ہر سال اقبالؔ سے متعلق شائع شدہ مضامین کی فہرست شائع کرتی رہتی ہے لیکن چونکہ اکادمی کا دائرۂ عمل فقط اقبالؔ تک ہی محدود ہے اس لیے جو لوگ اُردو ادب کے دوسرے موضوعات پر کام کرتے ہیں، وہ ضرور کئی دشواریاں محسوس کرتے ہوں گے۔ حالانکہ میرؔ، انیسؔ، شبلیؔ، مولوی عبدالحق، سید سلیمانؔ ندوی، مولانا آزادؔ، عبدالودود، فیضؔ اور آل احمد سرورؔ وغیرہ جیسے شاعروں اور دانشوروں کی شائع شدہ تحریروں پر مختلف رسائل و جرائد میں موضوعاتی اشاریئے چھپ چکے ہیں لیکن یہ امتیاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہے، جن کی تحریروں کے اشاریئے مُرتب ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ان لوگوں میں غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ اور فیضؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

عبداللہ خاورؔ اس وقت اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی میں لائبریرین کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ انھیں آل احمد سرور، پروفیسر عالم خوندمیریؔ اور پروفیسر مسعود حسین خان جیسے عالموں اور فاضلوں کی سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان اہلِ اقلیم سے انھیں عام طور پر ادب سے متعلق اور خاص طور پر علامہ اقبال سے متعلق بہت کچھ سیکھنے اور جاننے کا موقعہ ملا ہے۔اس کے علاوہ اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ میں اقبالؔ سے متعلق نادر کتابوں، خاص نمبروں اور نایاب رسائل و جرائد کے گوہرِ نایاب سے بھی عبداللہ فیض اٹھا چکے ہیں۔

عبداللہ خاور اُردو ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کی طرف اُن کا رجحان ابتدا سے ہی تھا۔کالج کے دنوں میں بہت اچھے مضامین لکھ چکے ہیں۔ چنانچہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھیں لائبریری میں کام کرنے کا موقع ملا تو اُن کے اس شوق کو ہوا لگ گئی اور وہ سنجیدگی سے ادب کے مختلف موضوعات پر سوچنے لگے۔انھوں نے اشاریئے مُرتب کرنا اپنی جولاں گاہ کیوں بنائی؟ اس کے بارے میں انھوں نے کتاب میں کہیں ذکر نہیں کیا۔وہ اس کو ''زہرہ گداز مہم'' قرار دیتے ہیں۔جس کو سر کرنے کی انھوں نے پوری پوری کوشش کی۔البتہ اقبالیات کے گہرے مطالعے اور انسٹی ٹیوٹ کے کاملوں کی مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ اشاریئے مُرتب

کرنے کی طرف راغب ہوئے اور اب تک کئی اشاریئے مُرتب کر چکے ہیں۔

''مفتاحِ اقبال'' ریسرچ اسکالروں خاص طور پر اقبالؔ پر کام کرنے والوں کے لیے ایک صحیفے سے کم نہیں۔ اس میں اقبالؔ کی شخصیت اور فن کے گونا گوں موضوعات پر اشاریئے ملتے ہیں۔ عبداللہ خاورؔ نے اقبالؔ سے متعلق جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے اُن کی تفصیل یوں ہے:

اجتہاد، اسلوب، اماکن، انسانیت، تاثرات، تبصرے اور جائزہ، تصورِ ابلیس، تصورِ خودی، تصورِ زماں و مکاں، تصوف، تعلیم، تنقید و تحقیق، خطبات، خطوط، سماجیات، سوانح، سیاست، شعری محاسن، عشقِ رسولؐ، عہد، غزل، فکروفن، فن، فلسفہ، قرآن، مذہب، مردِ مومن، مسجدِ قرطبہ، مشاہیر، مغرب، نظم، نوجوان، متفرقات وغیرہ۔ اگرچہ یہ موضوعات اقبالیات کا پورا احاطہ نہیں کرتے لیکن عبداللہ خاورؔ کی کوششوں سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا جن رسائل و جرائد تک اُن کی رسائی ہوئی، اُنھوں نے پوری دیانتداری سے اُن کی نشاندہی کی اور اس طرح سے ایک ایماندار لائبریرین اور اشارئیہ نگار کا فرض نبھایا ہے۔ خاورؔ نے نہ صرف ماہناموں اور خاص نمبرات کو زیرِ نظر رکھا بلکہ ہندو پاک میں شائع ہونے والے روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کو بھی ملحوظِ نظر رکھا نیز اقبالؔ کے فکروفن پر ترتیب دی گئی کُتب اور مختلف اداروں اور یونی ورسٹیوں کی تقریبات میں پڑھے گئے پرچوں کا انتخاب کر کے کتابی صورت میں شائع ہونے والی کتابوں کو بھی خاورؔ نے بڑے سلیقے سے ترتیب دے کر ''مفتاحِ اقبالؔ'' میں شامل کیا ہے۔ عبداللہ خاورؔ نے شاعر بمبئی، صحیفہ لاہور، سب رس حیدر آباد، شیرازہ سرینگر، نقوش لاہور، نیرنگ خیال لاہور، جوہر دہلی، فنون لاہور، تحریک دہلی، الحمرا لاہور، اُردو دہلی، شاداب حیدر آباد، رسالہ اُردو دہلی، علی گڑھ میگزین علی گڑھ وغیرہ جیسے مقتدر رسائل و جرائد کے خاص نمبرات کا بغور جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اقبالؔ سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں میں سے مختلف موضوعات کے تحت مضامین کے اندراجات بھی ریسرچ اسکالروں کی سہولیات کے لیے ''مفتاحِ اقبال'' میں شائع کیے ہیں۔

''مفتاحِ اقبالؔ'' اقبالؔ سے متعلق اطلاعات سے مالا مال ہے۔ اقبالؔ سے متعلق بعض موضوعات ایسے ہیں جن پر کثرت سے لکھا گیا ہے۔ ان کو عبداللہ خاور نے بڑی خوبی کے ساتھ اشاریئے میں شامل کیا ہے۔ چوں کہ موضوعات حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیے گئے

ہیں۔اس لیے قارئین کو دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔کتاب کا گیٹ اپ دیدہ زیب ہے، کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی یہ کتاب خوب صورت ہے۔سرورق معنی خیز اور قیمت مناسب ہے۔

(ماہنامہ ''شیرازہ'' سری نگر جلد ۳۵ شمارہ ۱۰-۹)

# انشا کا ترکی روزنامچہ

مرتبہ ڈاکٹر نعیم الدین

انشا اللہ خاں انشا ایک بلند پایہ شاعر اور ایک عالم ہونے کے علاوہ ایک قابلِ قدر زبان دان بھی تھے۔ انھیں اُردو اور فارسی کے علاوہ بعض دوسری زبانوں پر بھی دست رس حاصل تھی۔ ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ انشا نے اُردو کو ایک دیوان کے علاوہ ''دریائے لطافت''، ''لطائف السعادت''، ''رانی کیتکی کی کہانی''، ''سلک گوہر'' جیسی اہم کتابیں بھی دی ہیں۔

''انشا کا ترکی روزنامچہ'' اُن کی ایک اہم یادگار ہے۔ یہ روزنامچہ ترکی زبان کے اس لہجے میں تحریر کیا گیا ہے جسے ''چغتائیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ''چغتائیہ'' ترکی زبان کی ایک شاخ ہے جو وسط ایشیا میں رائج تھی۔ اُردو میں لسانیات، تاریخ، عمرانیات، معاشیات، تجارت، فلسفہ، قانون، جغرافیہ، امورِ حکومت اور نفسیات جیسے مضامین پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ترقی اُردو بیورو نئی دہلی کی مساعی اس ضمن میں قابل ستائش ہے کہ جو اس نے اس طرح کے موضوعات پر کتابیں تیار کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔

''انشا کا ترکی روزنامچہ'' ایک دلچسپ تصنیف ہے جس کو ڈاکٹر نعیم الدین نے نہایت ہی دلکش انداز میں ترکی سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ روزنامچہ ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انشا

کے نجی حالات کے علاوہ اُس زمانے کی معاشی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی حالات بھی درج ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تصنیف ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ انشا کی مادری زبان اُردو ہے۔ اِسی لیے اُنھوں نے ترکی روزنامچے میں بعض اُردو ہندی کے الفاظ بھی نہایت ہی بلیغ انداز میں استعمال کیے ہیں۔ مثلاً موچھل، چائے، پانی، آب، آگ اور اسی طرح کے الفاظ بار بار نظر آتے ہیں۔

کتاب کے مقدمہ میں مترجم نے انشا کی نجی زندگی پر بخوبی روشنی ڈالی ہے جس سے اُن کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ روزنامچہ کا دوسرا باب ترجمۂ متن کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ ترجمہ کاری ایک مشکل فن ہے۔ ترجمہ کار کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ دوسری زبان کی روح کو صحیح آہنگ کے ساتھ منتقل کرکے زیرِ بحث کتاب میں مترجم نے یہ حق بہ احسن ادا کیا ہے۔ لیکن بعض جگہوں پر فارسیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور ثقیل اور خلافِ روزمرّہ الفاظ و تراکیب کا استعمال کھٹکتا ہے۔ مثلاً

۱ ایک دِن باورچی نے دوملہ (سموسہ) جیسا عمدہ قثاء الحمار نا چیز

۲ اللہ جل وشانہٗ وعم احسانہ۔

۳ دیکھتا ہوں کہ حضور صحن میں مختلی بابطع ٹہل رہے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض عربی تراکیب اُسی صورت میں لکھی گئی ہیں جن کا مترجم نے کوئی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اس طرح سے اِس روزنامچہ کو پڑھنے اور سمجھنے میں کافی دشواری درپیش آتی ہے۔ مترجم کو چاہئے تھا کہ اُن کا ترجمہ بھی اُردو میں کرتے۔

ڈاکٹر نعیم الدین نے ''حواشی'' کے عنوان سے تیسرے باب میں ترجمۂ متن میں آئے ہوئے مختلف لوگوں سے تعارف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ اُن الفاظ اور تراکیب کی وضاحت بھی کی گئی ہے جو وضاحت طلب ہیں۔ حواشی کا باب اس روزنامچہ کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسے بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے۔

''انشا کا ترکی روزنامچہ'' معلومات کا خزانہ ہے۔ اس سے نہ صرف ترکی زبان وادب

جاننے والے ہی مستفید ہو سکتے ہیں بلکہ اُردو زبان وادب کے شیدائیوں کے لیے بھی یہ تصنیف کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ عمدہ ہے۔ ترجمہ اُردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ماہنامہ شیرازہ (نوجوان نمبر) جلد ۱۹ شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۸۰ء)

# کشمیر میں اشاعتِ اسلام (ریشیاتِ کشمیر کی خدمات کا ایک تاریخی جائزہ)

محمد اسحاق خان

پروفیسر محمد اسحاق خان کی انگریزی تصنیف Kashmir's Transition of Islam کا اردو ترجمہ ہے۔جس کا پہلا ایڈیشن 1994ء میں جنوبی ایشیا کے نامور اشاعتی ادارے منوہر پبلی کیشنز نئی دہلی نے شایع کیا اور 1997ء میں اسی ادارے نے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شایع کیا۔کتاب کی افادیت میں اُس وقت اضافہ ہوگیا جب بین الاقوامی شہرت یافتہ مورخ Maxwell Easton نے جرنل آف اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ میں اس کتاب پر تبصرہ کیا۔وہ اپنے تبصرے میں ڈاکٹر خان کے اس تحقیقی کارنامے کی دل کھول کر داد دیتے ہیں اور اس کو کشمیر میں اشاعت اسلام کے موضوع پر ایک بنیادی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

پروفیسر محمد اسحاق خان کتاب کے اردو ترجمے کے بارے میں رقمطراز ہیں:

'' جہاں علمی حلقوں میں اس کام کی خاصی پذیرائی ہوئی وہیں
بعض احباب کی رائے یہ تھی کہ کتاب میں چونکہ عالمانہ اسلوب
بیان اختیار کیا گیا ہے اس لئے عام قاری عموماً اور اُردو داں

طبقہ خصوصاً اس سے مستفید نہیں ہو سکتا اس لئے کتاب کی اہمیت
اور افادیت کے پیش نظر اس کا اردو اڈیشن تیار کیا جائے۔''

پروفیسر محمد اسحاق خان کی اس تصنیف کا ترجمہ کشمیر کے ایک معروف ریسرچر ڈاکٹر بدر الدین بٹ نے کیا ہے۔ان کے انداز بیان اور اسلوب نے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا آغاز مصنف کے مختصر سے تعارف سے ہوتا ہے جس میں پروفیسر خان کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔اس کے بعد پروفیسر خان نے زیر تبصرہ کتاب کے ترجمے کے بارے میں روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اس بات میں شک نہیں کہ ترجمہ اصل کی جگہ نہیں لے سکتا لیکن
جس عرق ریزی اور جانفشانی سے میری رہنمائی کے تحت ترجمہ
کیا گیا ہے میں اس سے بڑی حد تک مطمئن ہوں۔ مترجمین نے
نہ صرف صحتِ زباں کا خیال رکھا ہے بلکہ نفسِ مضمون پر بھی ان
کی اچھی نظر ہے۔''

کتاب کا تعارف انتالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔جس میں اشاعت اسلام کے بارے میں تفصیل سے بات کی گئی ہے اور تذکرہ ہائے اولیا، غیر کشمیریوں کی تصانیف، کشمیری ادب اور لوک روایات اور اسلام پر جدید محققین کے کام وغیرہ جیسے موضوعات پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے باب اول میں قبول اسلام کے تصوراتی نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر ریشی تحریک کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد شیخ نورالدین ریشی کے سماجی اور مذہبی ماحول کے بارے میں بحث ملتی ہے۔ کتاب کا باب چہارم شیخ نورالدین کی مذہبی زندگی کے مختلف ادوار اور اس کے سماجی اثرات کا احاطہ کرتی ہے۔ پانچویں باب میں پروفیسر خان نے حضرت شیخ نورالدین کی مذہبی فکر پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر رشی تحریک کے تئیں صوفی سلاسل کے موقف کے بارے میں اظہارِ خیال ملتا ہے۔اس کے بعد تبدیلیٔ مذہب میں ریشیوں کے رول کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کرامات اور اساطیر کے اجتماعی ابعاد بھی زیرِ بحث کتاب کا ایک اور ذرین باب ہے۔آخری باب میں پروفیسر خان بڑے خوبصورت انداز

میں مجموعی تاثر پیش کرتے ہیں۔

ادب اور تاریخ کا اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن تاریخ میں مورخ کو بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ پروفیسر خان بھی اس عمل سے گذرے ہیں۔ انہوں نے حالات وواقعات، سنین، حواشیوں اور حوالوں سے اپنی تحقیق میں جان ڈال دی ہے۔ ان کی تحقیق وتگ داد دینے کے لایق ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے۔ انہوں نے اپنی بات منوانے کے لیے نہ صرف فارسی مخطوطات سے کام لیا ہے بلکہ کشمیری، سنسکرت، عربی اردو اور انگریزی مخطوطات اور مطبوعات بھی ان کے پیش نظر رہی ہیں کتاب میں ضمیمہ شامل کر کے مصنف نے کتاب کی افادیت میں اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔

ڈاکٹر بدرالدین بٹ نے جس خوبی کے ساتھ پروفیسر خان کی اس تصنیف کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے وہ قابل داد کوشش ہے۔ اس تحقیقی کام کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا کہیں بھی شبہ تک نہیں ہوتا کہ یہ تحقیقی کام انگریزی زبان سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے اور یہ مترجم کی قلم کی خوبی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں کہیں کہیں انگریزی الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا کرنا بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے لازمی تھا۔ لیکن اس کے باوجود ترجمہ رواں دواں صورت اختیار کر گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ترجمے میں کشمیری الفاظ اور تراکیب کا حسن برقارر رکھنے میں نہایت ہی فنکارانہ انداز نظر اختیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر ایک باب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور پھر خون جگر کی آمیزش سے اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اور یہ بڑی اہم بات ہے

میں مورخ اور مترجم دونوں کو ایسی جاندار کتاب منظر عام پر لانے کے لئے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(ماہنامہ شیرازہ، سری نگر، جلد ۴۲ شمارہ ۱۰ ۲۰۰۴ء)

# شیرازہ کا عبدالاحد آزاد نمبر۔ ایک جائزہ

مرتبہ محمد اشرف ٹاک

عبدالاحد آزاد نہ صرف کشمیری زبان کے ایک عہد ساز شاعر تھے بلکہ وہ ایک بالغ نظر محقق، تذکرہ نگار، ادبی موّرخ اور نقاد کے طور پر بھی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے آفاق گیر پیغام دیا۔ آزاد نے اپنی شاعری میں انقلاب کے گیت بھی گائے اور رومانی شاعری میں بھی اپنا سکّہ جما لیا۔ فطرت کے مناظر کی بھی عکاسی کی اور قومی اور وطنی شاعری میں بھی اپنا بھرپور حصہ ادا کیا۔ طنز وظرافت کے تیر بھی چلائے اور اپنے دور کے آشوب کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھال دیا اور اس طرح سے وہ خاص وعام میں شاعرِ انسانیت کے نام سے مشہور ہوئے۔ آزاد نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی اور اس زبان میں بھی اپنے نقشِ پا چھوڑے ہیں۔ اُنھوں نے تحقیق کے میدان میں بھی اپنی بے پناہ محنت، لگن اور صلاحیت سے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا۔ آزاد نے اپنی تاریخ ساز تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' سے کشمیری ادب میں تحقیق وتنقید کے دروازے وا کیے۔ یہ ضخیم کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کے زیرِ اہتمام بہت پہلے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس طرح سے آزاد عمر بھر کشمیری زبان وادب کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔

آزاد ۱۹۴۸ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کے انتقال کو اب ۵۰ سال سے بھی زائد عرصہ ہوا لیکن افسوس کہ ابھی تک اس بلند فکر شاعر اور محقق کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے ریاستی کلچرل اکادمی کی یہ کوشش لائق ستائش ہے کہ اس ادارے نے اُردو شیرازہ کا عبدالاحد آزاد نمبر شائع کیا ہے۔ یہ خاص نمبر شائع کر کے اس علمی وادبی اِدارے نے نہ صرف کشمیر کے اس مایہ ناز فرزند سے انصاف کیا بلکہ کشمیری شعروادب کی بھی بے لوث خدمت کی۔ اس خاص نمبر سے آزاد کے شعروادب کا بھرپور جائزہ قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔ اس بات کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ریاستی کلچرل اکادمی ریاست کی تہذیب، تمدن، ادب اور کلچر کی ترقی وبقا کے لیے سال ہا سال سے کام کرتی آئی ہے۔ اس اِدارے نے اب تک باقی تمام علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو، ہندی، ڈوگری، کشمیری، پہاڑی اور گوجری زبانوں کی درجنوں کتابیں شائع کی ہیں۔

اس کے علاوہ اس علمی وادبی وثقافتی ادارے کی طرف سے سال ہا سال سے باقی تمام علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُردو اور کشمیری زبانوں میں ایک موقر جریدہ شیرازہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اس جریدے کو شروع سے ہی ملک کے مستند قلم کاروں اور شاعروں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ گذشتہ برسوں میں اس جریدے کے عام شماروں کے علاوہ متعدد خاص نمبر بھی منظرِ عام پر آگئے ہیں جن میں ''لل دید نمبر''، ''ثقافت نمبر''، ''شیخ العالم نمبر''، ''پریم چند نمبر''، ''افسانہ نمبر''، ''اقبال نمبر''، ''اُردو کانفرنس نمبر''، ''کامگار نمبر''، ''عجائبات نمبر''، ''مغل نمبر''، ''شاہ ہمدان نمبر''، ''صوفیانہ موسیقی نمبر''، ''اولیا نمبر'' وغیرہ ذکر کے قابل ہیں۔ شیرازہ کا ''عبدالاحد آزاد نمبر'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

آزاد نمبر ۵۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۵ مقالات شامل ہیں جو کشمیری زبان کے مستند ادیبوں، دانشوروں، آزاد کے دوستوں اور شاگردوں نے لکھے ہیں۔ اس نمبر کا آغاز عبدالأحد آزاد کی ایک نایاب تصویر سے ہوتا ہے۔ تصویر کے نیچے آزاد کا یہ شعر درج ہے ۔

عالم کرِ یاد آزاد! آزاد

[illegible]

(تمام دُنیا کسی نہ کسی وقت آزاد کو یاد کرے گی اُس وقت میں تمہیں یاد دلاؤں گا...... میرے محبوب ) تصویر کے دوسری طرف آزآد کا عکس تحریر تبرک کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

شیرازہ کے اس خاص نمبر کی فہرست پر نظر ڈالیے تو آزآد کی شخصیت، شاعری اور اُن کی تحقیق سے متعلق رنگارنگ موضوعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جن کے لکھنے والے کشمیری زبان کے قدرِ اوّل کے ادیب اور نقادانِ فن ہیں۔ آزاد پر لکھے گئے یہ تمام مقالات نہایت ہی محنت سے لکھے گئے ہیں اور اس کے مدیر محمد اشرف ٹاک نے بڑی ذہانت اور دیانت داری کا ثبوت فراہم کر کے ان مقالات کا انتخاب کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ آزآد نمبر میں شامل مقالات میں خود بہ خود تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔ آزآد نمبر کا مطالعہ کرتے ہوئے آزآد کی ولادت سے لے کر اُن کی رحلت تک بعض اہم واقعات سلسلہ وار آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت اور تصانیف کے بارے میں بھی بھرپور جانکاری ملتی ہے۔ آزآد نمبر سے عبدالاحد آزآد کی نجی زندگی کے بارے میں بھی تفصیلات فراہم ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر کہا جائے کہ یہ نمبر شاعرِ انسانیت عبدالاحد آزآد کا ایک بھرپور مطالعہ پیش کرتا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ میں پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے اس کے مندرجات کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

۱ آزآد کی شخصیت

۲ آزآد کی شاعری

۳ آزآد کی تحقیق وتنقید

آزآد نمبر میں آزآد کی شخصیت پر لکھے گئے مقالات قابلِ قدر ہیں۔ ''آزاد۔ چند باتیں'' کشمیری زبان کے سربرآوردہ ادیب جناب امین کامل کا مقالہ ہے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں کامل صاحب نے عبدالاحد آزآد سے متعلق چند ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جن سے آزاد مرحوم کی شخصیت کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ اپنے مقالے میں انھوں نے آزآد کے عشق، آزآد کی ناسازگار طبیعت، آزآد کے آخری لمحات، آزآد کی ترقی پسندی، بزاز صاحب کے ساتھ اُن کے تعلقات، اُن کی خودداری،

شاعرِ کشمیر مہجورؔ کے ساتھ اُن کے مراسم اور آزادؔ کی صحیح تاریخِ وفات کا تعین کیا ہے۔

''عبدالاحد آزادؔ'' کے عنوان سے آزادؔ نمبر میں ریاست کے نامور شاعر اور محقق موتی لال ساقی کا پُر مغز مقالہ شامل ہے۔ اس مقالے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ذوہامہ اسکول میں ساقی صاحب آزادؔ مرحوم کے شاگرد رہے ہیں۔ ساقی صاحب نے اپنے مقالے میں آزادؔ سے متعلق یادیں کچھ اس طرح سے قلم بند کی ہیں کہ آزادؔ کی پوری شخصیت کا خاکہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ مقالہ اپنے استاد مرحوم کے تئیں ساقی صاحب کی عقیدت و احترام کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

آزادؔ نمبر میں شامل مقالات ''عبدالاحد آزاد۔ چند تاثرات''، ''عبدالاحد آزادؔ اور اس کا زمانہ''، ''عبدالاحد آزاد میری نظر میں''، ''عبدالاحد آزادؔ۔ شخصیت اور شاعر''، ''عبدالاحد آزادؔ'' اور عبدالاحد آزادؔ۔ کچھ یادیں'' بھی شخصیت کے ذیل میں آنے والے چند مقالات ہیں۔ ان کے مقالہ نگار بشیر بشر، ارجن دیو مجبورؔ، عبدالغنی، سید رسول پونپر اور مرزا غلام حسن بیگ عارف ہیں۔ ان مقالات سے بھی مرحوم آزادؔ کی شخصیت سے متعلق بعض اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔

مرزا عارف نے اپنے مقالے میں آزادؔ کو شرافت اور سادگی کا مجسمہ قرار دیا ہے۔ سیّد رسول پونپر نے آزادؔ کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کا ذکر کیا ہے اور ارجن دیو مجبورؔ نے آزادؔ کے زمانے کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آزادؔ کی شاعری تجزیہ کرنے کے لیے شیرازہ کے آزادؔ نمبر میں ۱۵ مقالات شامل ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:

عبدالاحد آزاد، ادیب اور سماج' آزادؔ کی نظر میں' مرحوم آزادؔ اور تحریکِ آزادی' آزادؔ کی نظم نگاری' عبدالاحد آزادؔ۔ اپنی منظومات کے آئینے میں' آزادؔ کی بعض اہم منظومات۔ میری نظر میں' آزادؔ کی شاعری میں سماجی شعور' عبدالاحد آزادؔ کی شاعری میں وطن دوستی' آزادؔ کی شاعری میں طبقاتی شعور' اور آزادؔ کی شاعری پر اقبال کے اثرات۔ یہ مقالات سیّد رسول پونپر، پروفیسر پشپ، غلام نبی گوہر، شفیع شوق، غلام نبی ناظر، [illegible] منشور بانہالی اور محمد

اسداللہ وانی جیسے عالموں اور دانشوروں کی فکر کا نتیجہ ہیں جن کا شمار کشمیری زبان کے صفِ اوّل کے محققین میں ہوتا ہے۔ سیّد رسول پونپر نے اپنے مقالے میں آزادؔ کی شاعری اور اس کے محرکات کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر پشپ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ادب اور سماج کی ذمہ داریوں کو کس حد تک آزادؔ نے محسوس کیا تھا۔ اُن کے مطابق سماجی ناہمواری کے شدید احساس نے آزادؔ کے ذہن میں ایک بھاری تلاطم مچا دیا تھا۔ وہ سوشلزم کی تحریک کے بہت قریب آگئے اور سوشلزم کے نظریاتی اثرات قبول کر کے ایک ایسے انقلابی تحریک کے ترجمان بن گئے جو انسان کے ذہن اور کردار دونوں کو حقیقی معنوں میں انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔

غلام نبی گوہرؔ آزادؔ کو تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے علمبردار ٹھہراتے ہیں۔ آزادؔ کی نظم نگاری پر شفیع شوق نے بھرپور روشنی ڈالی ہے اور اِس بات پر زور دیا ہے کہ آزادؔ ایک بہترین نظم نگار تھے۔ وہ آزادؔ کی نظموں کو نئے اندازِ نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن کی نظموں کو غزلوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ طلب اور فنّی اعتبار سے پختہ اور جامع قرار دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق آزادؔ نے فلسفیانہ شاعری کی طرح استعارے اور مجازِ مرسل کے متوازن استعمال سے شعری زبان میں نئے نئے معنی و مفاہیم پیدا کیے ہیں۔

''آزادؔ کی بعض اہم منظومات۔ میری نظر میں'' غلام نبی ناظرؔ کا فکر انگیز مقالہ ہے۔ اُن کے مطابق آزادؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طبقاتی شعور، انقلابی آواز اور انسانیت اور امن دوستی اور اقتصادی مسائل سے کشمیری شاعری کو ہمکنار کیا۔ وہ آزادؔ کے ساتھ ناانصافی برتنے کا الزام کشمیری نقادوں پر عائد کرتے ہیں۔ آزادؔ کی شاعری میں سماجی شعور اور عبدالاحد آزادؔ کی شاعری میں وطن پرستی بھی جاذبِ نظر مقالات ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسداللہ وانی کا مقالہ ''عبدالاحد آزادؔ کی شاعری پر اقبال کے اثرات'' بھی ایک عمدہ مقالہ ہے۔ ڈاکٹر وانی کے مطابق اگرچہ جدید کشمیری شعراء میں اقبالؔ کے اثرات قبول کرنے والے شعراء میں شاعرِ کشمیر مہجورؔ کا نام سرِفہرست ہے لیکن عبدالاحد آزادؔ کی شاعری پر علامہ اقبالؔ کے سب سے زیادہ اثرات نمایاں ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف اقبالؔ کے

اسلوب وآہنگ اورفن وفلسفہ کواپنی شاعری میں جگہ دی بلکہ اقبآل کے اصطلاحات وعلائم سے بھی خوب کام لیا ہے۔

آزآد کی نثر نگاری کے موضوع پر آزآدنمبر میں جو مقالات شامل کیے گئے ہیں وہ بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ اِن میں بھی آزآد کی شخصیت اور اُن کی شاعری کی طرح اس خاص نمبر کے مدیر تسلسل برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔آزآدنمبر کے اس حصّے میں عبدالاحد آزآد کی تحقیق وتنقید کے بارے میں مدلل بحث ملتی ہے۔ اِن مقالات میں غلام نبی خیآل کا''کشمیری زبان اور شاعری۔ تجزیاتی مطالعہ'' آفاق عزیز کا''عبدالاحد آزآد۔ جدید تحقیق کی روشنی میں''، مشتاق احمد مشتآق کا''آزآد بہ حیثیت نقاد''، شمیم احمد شمیؔم (مرحوم) کا''آزآد کا شعور'' اور محمد یوسف ٹینگ کا دیباچہ''کشمیری زبان اور شاعری'' وغیرہ جیسے مقالات قابلِ مطالعہ ہیں۔ مرحوم شمیم احمد شمیؔم کا مقالہ ریاستی محکمہ اطلاعات کے مجلّہ تعمیر کے آزآدنمبر میں ۱۹۵۸ء میں یہ شائع ہو چکا ہے لیکن یہ مقالہ اپنی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر بہ طورِ خاص شیرازہ کے آزآدنمبر میں دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔

آزآد کی قابلِ قدر تصنیف''کشمیری زبان اور شاعری'' کی دوسری جلد کشمیری زبان کے قد آور محقق اور نقاد محمد یوسف ٹینگ نے ۱۹۶۰ء میں اپنے فکر انگیز اور پُر مغز دیباچے کے ساتھ ترتیب دی تھی۔ اس دیباچے کو بھی مدیر شیرازہ نے اس کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر آزآدنمبر میں شامل کیا ہے۔اس میں ٹینگ صاحب نے آزآد کو ہمہ جہت صلاحیتوں کا مالک قرار دیا ہے اور ساتھ ہی اُن کے تنقیدی شعور پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔

تاریخِ شعرائے کشمیر کا اوّلین نسخہ موتی لال ساقؔی (مرحوم) کا مقالہ ہے جو پہلے ہی شیرازہ کشمیری میں شائع ہو چکا ہے۔اس مقالے کو ظفر مظفر نے شیرازہ اُردو کے آزآدنمبر کے لیے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ دراصل مرحوم آزآد کے قلمی نسخے''تاریخِ شعرائے کشمیر'' کا جائزہ ہے۔اس مقالے کے مطالعے سے بھی بعض اہم باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

''آزاد کے خطوط'' اور'' آزاد کی شاعری میں ترجمے کے عناصر'' جیسے مقالات بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

''قصیدۂ علمدار یہ فارسی'' اور'' آزاد کی ذاتی ڈائری۔بعض اندراجات'' شیرازہ کے آزاد نمبر میں شامل دو اہم تحریریں ہیں جن کی اہمیت اور افادیت پر کشمیری زبان کے معروف ادیب غلام نبی گوہر نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ دونوں تحریریں دستاویزی اہمیت رکھتی ہیں۔

آزاد کی نایاب تحریریں اور تصویریں شامل کر کے اِدارے نے اس خاص نمبر کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔

آزاد نمبر کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ یہ ریاست کے معروف آرٹسٹ جی.احمد کی فکر کا نتیجہ ہے۔اس کی کتابت محمد انور شاہ لولابی نے کی ہے اور مہکاف پرنٹر دہلی سے یہ خاص نمبر شائع ہوا ہے۔اس کی قیمت صرف ۵۰ روپے مقرر کی گئی ہے جو اس گراں بازاری کے دور میں نہایت ہی مناسب ہے۔

میں اس قابلِ قدر نمبر کی اشاعت پر ریاستی کلچرل اکادمی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

# سلام و پیام

مرتبہ امین بنجارا

امین بنجارا نہ صرف اُردو کے ایک باصلاحیت افسانہ نگار ہیں بلکہ وہ ادب کے کئی میدانوں میں طبیعت آزما چکے ہیں۔ وہ صحافت کے پیشے سے بھی شغف رکھتے ہیں اور ڈرامے اور فیچر بھی لکھتے ہیں۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی اپنا بھرپور حصّہ ادا کرتے ہیں اور تبصرہ نگاری میں بھی دِلچسپی رکھتے ہیں لیکن اصل میں وہ ایک افسانہ نگار ہیں اور اِس صنفِ ادب سے اُنہیں گہرا لگاؤ ہے۔

امین کی تین تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جن میں ''گمنام شخصیت'' (۱۹۸۵ء)، ''الاؤ'' (افسانوی مجموعہ ۱۹۹۵ء) اور ''نذرِ آزاد'' (۱۹۹۸ء) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سلام و پیام اُن کی تازہ ترین تصنیف ہے، جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ دراصل اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مشاہیرِ ادب نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ ان خطوط سے پروفیسر آزاد کے مختلف مشاہیرِ ادب سے گہرے روابط کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں[1]۔ اُن کی گوناگوں موضوعات پر لکھی گئی بہت ساری تصانیف شائع ہو چکی ہیں، جن کی اہمیت سے انکار کرنا کور ذوقی ہوگی۔ آزاد

---

[1] آزاد صاحب گزشتہ برس انتقال کر گئے

صاحب نے اپنی زندگی کے بیشتر لمحات پڑھنے لکھنے میں صرف کیے ہیں۔ اُنہوں نے جہاں اقبالیات کے موضوع پر قابلِ قدر کام کیا ہے وہاں شعر و ادب کے مختلف موضوعات کو بھی منصۂ شہود پر لایا ہے۔ اگر چہ اُن کی بے شمار تصانیف شائع ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی اُن کے درجنوں مسودات منظرِ عام پر آنے سے رہ گئے ہیں۔ ان مسودات پر آزاد صاحب آج کل کام کر رہے ہیں اور ماضیٔ قریب میں ان کی اشاعت متوقع ہے۔ آزاد ایک واحد قلمکار ہیں جن کے مراسم ہر مکتبِ فکر کے تخلیق کاروں کے ساتھ رہے ہیں۔ اسی لیے اُن کے ذاتی کُتب خانے میں مسودات کے علاوہ خطوط کا ایک نادر ذخیرہ موجود ہے۔ ان تمام خطوط کی اہمیت مسلم ہے۔ امین بنجارا آزاد کے نہ صرف معتقد ہیں بلکہ وہ ان کے عاشق بھی ہیں۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے آزاد کے مختلف النواع پہلوؤں پر کام کر رہے ہیں اور اُنہیں ایک نئے انداز سے جانچنے، پرکھنے اور برتنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی وضاحت وہ ''سلام و پیام'' کے دیباچے میں یوں کرتے ہیں:

> ''دورِ حاضر کے بلند قامت و بلند مرتبہ شاعر و نثار، محقق و ناقد اور شارحِ اقبال، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی زندگی، شخصیت اور فکر و فن پر درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن ان جملہ موضوعات پر جو تصنیفات اور تالیفات اب تک منظرِ عام پر آئی ہیں اُن کے مطالعے کے دوران میں یہ بات بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ موضوع کے ساتھ مکمل طور پر انصاف نہیں ہو سکا کیونکہ آزاد کی حیات، علمی و ادبی خدمات اور اُن کے فن کے مختلف گوشے اب بھی تشنگیٔ اظہار کا شکار ہیں۔ جب کہ اُن پر بڑی گہرائی، گیرائی اور سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔''

امین نے جس انداز سے آزاد صاحب پر کام کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اُنہیں آزاد صاحب کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ آزاد صاحب کے علم و ادب کی مختلف سطحیں جاننے کے لیے وہ اُن کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے میں

گھنٹوں صرف کرتے ہیں۔ اس طرح سے اُنہیں آزاد کی زندگی کے ایک ایک پل کا مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ آزاد سے متعلق اُن کے کئی قابلِ قدر مقالات شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان مقالوں سے آزاد کی شخصیت اور اُن کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ سامنے آتا ہے۔ اس طرح سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امین، آزاد کے گمنام گوشوں کی تلاش و تجسس میں رطب اللسان ہیں۔ اُنہیں آزاد سے بے پناہ عقیدت ہے۔ اسی لیے آزاد کو اُنہوں نے اپنا محبوب موضوع بنایا ہے اور وہ بڑے تن دہی سے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ نذرِ آزاد، آزاد نامہ اور سلام و پیام (حصّہ اول) اسی عقیدت کے جذبے کا نتیجہ ہے۔ سلام و پیام (حصّہ اوّل) کے دیباچے میں امین اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ اُنہیں آزاد کے ذاتی کُتب خانے میں بیسیوں پرانی فائلیں اور مسودات دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر ان کو شائع کیا جائے تو یہ اُردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت ہوگی۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خود ''سلام و پیام'' (حصّہ اوّل) کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

> ''مجھے پروفیسر آزاد کے کُتب خانے سے بیسیوں ایسی نئی اور پرانی فائلیں ملیں ........... درجنوں فائلیں ایسی بھی تھیں جو ۱۹۸۸ء میں دریائے توی میں آئے سیلاب کی تباہ کاریوں کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ اس طرح کی سیلاب زدہ فائلوں میں موجود خطوط کی روشنائی، پانی اور مٹی لگ جانے کی وجہ سے اس قدر بکھر چکی تھی کہ اُنہیں پڑھنا محال تھا............ دوسرے اہم کاغذات کے علاوہ مشاہیر کے خطوط کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد سامنے آگئی اور دِل میں ایک ساتھ کئی خواہشات نے مچلنا شروع کر دیا۔ جس میں سے ایک خواہش کی تکمیل، سلام و پیام، (جلد اوّل) کی صورت میں سامنے ہے۔'' ص ۱۴

''سلام و پیام'' (جلد اوّل) ۲۷۰ صفحات پر مشتمل خطوط کا مجموعہ ہے جو ایور گرین کمپوزر اینڈ پبلشرز جموں (توی) کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ۲۱۲ خطوط اور ۱۴ار

اقتباسات شامل ہیں۔ یہ خطوط اور اقتباسات ۲۴ر جولائی ۱۹۴۹ء سے ۶ر فروری ۲۰۰۲ء تک یعنی ۵۳ سال کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان ۵۳ برسوں میں کتنے انقلابات آئے ہوں گے، کتنی تحریکیں اُبھری اور ڈوبی ہوں گی، اور سیاست، ادب اور سماج میں کتنی تبدیلیاں رونما ہوئی ہوں گی۔ ان تمام چیزوں کے ہلکے پھلکے اشارے ''سلام و پیام'' کے خطوط میں منقش ہیں۔ ''سلام و پیام'' کا پہلا خط اُردو کے قدر اوّل کے شاعر حضرت فراق گورکھپوری کا ہے جو اُنہوں نے آزاد صاحب کے نام ۲۴ر جولائی ۱۹۴۹ء کو بینک روڈ الہٰ آباد سے لکھا ہے اور اس مجموعے میں شامل آخری خط معروف شاعر اور نثر نگار پرتو روہیلہ نے ۳ر جنوری ۲۰۰۱ء کو تحریر کیا ہے۔ اس طرح سے یہ ایک دِلچسپ گلدستہ بن گیا ہے۔

امین نے خطوط کے اس مجموعے کا انتساب اُردو کے تین قد آور قلم کاروں اور دانشوروں پروفیسر آل احمد سرور، علی سردار جعفری اور قتیل شفائی کے نام کیا ہے۔ یہاں بھی امین کا بزرگ ادیبوں اور دانشوروں کے تئیں عقیدت و احترام کا جذبہ عیاں ہے۔ ان تینوں قلم کاروں کو آزاد صاحب کے قریبی معاصرین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد واجبات کے عنوان سے اُنہوں نے پروفیسر آزاد کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کیا ہے کہ اُنہوں نے اپنی تمام خطوط کی فائلیں مرتب کے حوالے کر کے نہ صرف انہیں شائع کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ ان خطوط پر حواشی لکھنے میں بھی اُنہیں حسبِ ضرورت اپنے مشوروں سے نوازا ہے۔ امین نے اپنے بچوں عمران، عرفان اور عثمان کا بھی شکریہ ادا کیا ہے کہ ان بچوں نے اپنے مطالعے اور کھیل کود کے اوقات کو ہزارہا خطوط کے چھانٹنے، تاریخِ تحریر کی پرچیاں لگانے اور ان خطوط کو الگ الگ فائلوں میں محفوظ کرنے پر قربان کیا ہے۔ درشن سنگھ چودھری، شبانہ شکیل خان اور ناہید اختر نائیک کا امین اس لیے شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتے ہیں کہ ان تینوں نے بڑی محنت سے ان خطوط کی پروف ریڈنگ میں مرتب کا ہاتھ بٹایا ہے۔ ''سلام و پیام'' میں شامل خطوط کی فہرست ۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۴۷ مشاہیر ادب کے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ امین نے یہ خطوط شائع کر کے نہ صرف ایک سچّے محقق کا فرض نبھایا ہے بلکہ اُردو زبان و ادب کی بھی بے لوث خدمت کی ہے۔ آزاد صاحب کی یہ فائلیں نہایت ہی خستہ حالت

میں تھیں۔ ان پر وقت کی دھول چڑھی ہوئی تھی اور بعض فائلیں دیمک کی زد میں آ کر تباہ ہو چکی تھیں۔ یہ امین کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اُن کی بے پناہ محنت سے خطوط کا یہ نادر سرمایہ تلف ہونے سے بچ گیا ہے۔

''سلام و پیام'' (حصہ اوّل) میں امین بنجارا نے جو دیباچہ تحریر کیا ہے وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ یہ بسیط دیباچہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس دیباچے میں خطوط نگاری کے فن سے متعلق بعض اہم مباحث سامنے آتے ہیں۔ امین خطوط کو مشاہدات، خیالات، احساسات اور محسوسات کا معتبر ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

امین نے اپنے دیباچے میں جس طرح سے انسانی زندگی میں خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، وہ قابلِ توجہ ہے۔ اُنہوں نے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے باہمی تال میل اور روابط کی روشنی میں چند بہت ہی اہم نکات پیش کیے ہیں۔ اُن کے مطابق خطوط ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جن سے مکتوب نگار کی شخصیت اور سیرت کا صحیح تعین ہوتا ہے۔ یہ مکتوب نگار اور قاری کے درمیان ایک پُل کا کام کرتے ہیں۔ اُنہوں نے خطوطِ غالب سے لے کر دورِ حاضر کے مکاتیبی ادب کا بڑے دِلنشین انداز سے جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خطوط شائع ہونے چاہئیں تاکہ اس صنف کی آبیاری ہو کیونکہ خطوط سے ہی تاریخ کے بے شمار واقعات سامنے آتے ہیں اور مختلف ادوار میں پیدا ہونے والی شخصیات کے علم وفن کی جانکاری فراہم ہوتی ہے۔ اُن کے مطابق مختلف قلم کاروں، شاعروں، دانشوروں اور تاریخ دانوں کے خطوط شائع کرنے کی حت الامکان کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہمارا شاندار ماضی تلف ہونے سے بچ جائے گا۔ کیونکہ خطوط ہی انسانی زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔

''سلام و پیام'' کے خطوط سے جہاں پروفیسر آزاد کی شخصیت، اُن کی شاعری اور اُن کی نثر نگاری پر مدلّل روشنی پڑتی ہے وہاں ان خطوط سے اُن کی تحقیق و تلاش کے کمزور پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ ان خطوط کے مطالعے سے قاری کو ادبِ آزاد کے صحت مند رجحانات کے ساتھ ساتھ اُن کے کمزور پہلوؤں سے بھی گزرنا پڑتا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ یہ پہلو خوش آئند پہلو ہیں کیونکہ ان کمزور پہلوؤں سے ایک شخصیت کی صحیح

تعمیر ہوتی ہے۔ بہر حال ''سلام و پیام'' کے خطوط سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ آزاد نہ صرف ایک عالم، دانشور، شاعر، محقق، نقاد اور تذکرہ نگار ہی ہیں بلکہ وہ ایک بردبار انسان بھی ہیں۔ زیرِ بحث خطوط کے مجموعے میں ایسے بھی خطوط ملتے ہیں جن میں آزاد کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اقبالیات سے متعلق اُن کے کام پر بے لاگ تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ بعض خطوط میں گلے شکوے بھی ہیں اور بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن میں آزاد صاحب کے کام کو سراہا گیا ہے اور اُن کے اشعار پر جھوم جھوم کر داد بھی دی گئی ہے۔ لیکن یہ آزاد صاحب کی دریا دلی ہے کہ اُنہوں نے اُن تمام پہلوؤں پر دوبارہ غور کیا (جن پر اُن کے معاصرین نے تنقید کی ہے) اور جہاں پر اُنہیں کوتاہی نظر آئی اُنہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اُس تنقید کو قبول کیا ہے۔ میرے خیال میں یہاں پر اس بات کی نشاندہی کرنی مناسب ہوگی کہ اگر اُن کے علاوہ اور کوئی شخصیت ہوتی تو وہ ان خطوط کا ضرور از سرِ نو جائزہ لیتی اور ان میں سے عبارت کا وہ حصّہ حذف کرتی جو قابلِ اعتراض حصّے ہیں۔ لیکن آزاد صاحب چونکہ ایک سچّے محقق اور ادیب ہیں، اُنہوں نے بغیر کسی چھان چھپٹ کے مرتب کو یہ خطوط من وعن شائع کرنے کی اجازت دے دی ہے اور یہ بڑی اہم بات ہے۔

اِن خطوط کے مطالعے سے قاری کو مختلف ادبی رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ اِن میں سے بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن سے بعض ادیبوں کی فنی کوتاہیاں، علم و ادب سے متعلق بعض اہم کتابوں اور نئے مصنفین کے بارے میں اطلاعات فراہم ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہ صرف عام قاری کے لیے مفید ہے بلکہ محققین کے لیے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ''سلام و پیام'' (حصّہ اوّل) میں مولانا صلاح الدین احمد، علی سردار جعفری، رفیع الدین ہاشمی، گیان چند جین، آل احمد سرور، مالک رام، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، خلیق انجم، پروفیسر زور، سہیل عظیم آبادی، مشفق خواجہ اور مظہر امام کے خطوط پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

''سلام و پیام'' (حصّہ اوّل) کے آخر پر جو ۱۲ صفحات پر مشتمل حواشی ہیں۔ اُس کی داد نہ دینا کور ذوقی ہوگی۔ اس میں مرتب نے اُن تمام مصنفین کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جن کا نام یا ذکر ان خطوط میں آیا ہے۔ اس طرح سے اُن مصنفین کے بارے میں پڑھنے والے کی جانکاری

میں اضافہ ہوتا ہے۔

''سلام و پیام'' (حصہ اوّل) کا گٹ اپ خوبصورت ہے۔اس کا ٹائٹل آزاد اور امین کی جاذب نظر تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصاویر کو دیکھنے سے بھی آزاد صاحب کے تئیں امین کا جذبۂ عقیدت عیاں ہوتا ہے۔ کتاب کی قیمت ۲۰۰ روپے ہے جو بہت ہی مناسب ہے۔ کتاب ایورگرین کمپوزرس اینڈ پبلشرز جموں (جے اینڈ کے) سے شائع ہوئی ہے۔

(ماہنامہ شیرازہ سری نگر جلد ۴۱ شمارہ ۱۱، ۱۲)

# تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا نام ریاست جموں وکشمیر کے نئے قلمکاروں کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ وہ نہ صرف افسانوں سے ہی اپنے دل کا درد کاغذ پر انڈیلتے ہیں بلکہ مختلف موضوعات پر مضامیں بھی لکھتے ہیں۔ تحقیق وتنقید سے بھی انہیں گہرا لگاؤ ہے اور شعرو شاعری کا بھی وہ شستہ مذاق رکھتے ہیں۔ ''ہزاروں غم'' کے نام سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شایع ہوا اور سنجیدہ علمی وادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔

ڈاکٹر مشتاق ضلع ڈوڈہ کے ایک دُور افتادہ مقام بھوتہ کے محلہ سروال، علاقہ مرمت میں ۳ مارچ ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے ان کے والد بزرگوار جناب محمد اسداللہ وانی ایک شریف النفس بزرگ ہیں۔ وہ مذہبی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق اسی ماحول میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے لیکن پڑھنے لکھنے کی طرف وہ شروع سے ہی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنے اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہیں نہ جانے کون سے پاپڑ بیلنا پڑے۔ ۱۹۸۰ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۵ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۸ء میں شعبہ اردو جموں یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۹۹۹ء میں شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی جموں کی طرف سے انہیں پی

ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ۔ ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹر مشتاق نے اردو میں قومی سطح کا امتحان نیٹ (NET) بھی امتیاز سے کامیاب کیا۔ مجھے اس بات سے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر مشتاق اب ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' کے نام سے اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ڈگری شایع کر رہے ہیں ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم کے بعد برصغیر ہند و پاک میں ایسے بہت سے سیاسی' سماجی' تہذیبی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے گہرے نقوش ، اردو ادب کی مختلف اصناف پر مرتسم ہوئے ہیں ۔اردو ناول نگاری کی صنف بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ چنانچہ بعض عمدہ ناول منظر عام پر آگئے جن میں ایسے معاملات کو زیر بحث لایا گیا اور اُن محرکات کی بازیافت کی گئی جنہوں نے تہذیبی سطح پر انسانی زندگی کو بحران کا شکار بنایا ہے۔ ،ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک حساس قلم کار ہیں ۔انہوں نے اس موضوع پر سنجیدگی سے سوچا ہے ۔اور بعض عمدہ نتائج اخذ کئے ہیں ۔سب سے پہلے انہوں نے لفظ تہذیب کی وضاحت کر کے جدید تہذیبی بحران کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہے ۔اس کے بعد اقوام عالم میں تہذیبی بحران کی نشاندہی کر کے اسے ماضی اور حال کے پس منظر میں جانچا اور پرکھا ہے اور پھر جدید تہذیبی بحران کے تناظر میں اردو کے بعض اہم ناول نگاروں کا تجزیہ کیا ہے ۔اس طرح سے تقسیم کے بعد اردو ناول نگاری کے تناظر میں تہذیبی بحران کا مکمل اور مربوط خاکہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ میں ڈاکٹر وانی کو اس تحقیقی وتنقیدی کام کی تکمیل پر مبارکباد دیتا ہوں۔

# مجھ سے کہا ہوتا

آنند لہر

ریاست جموں وکشمیر میں اگرچہ ناول نگاری کی طرف شروع شروع میں نثر کی دیگر اصناف کی طرح خاصی توجہ دی گئی اور بعض اچھے ناول سامنے آئے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب انسان اپنے مسائل میں گرفتار ہوا اور اُس کی فرصت کے لمحات محدود ہوتے گئے تو اُردو نثر کا یہ شعبہ شدید طور پر متاثر ہوا۔ لیکن پھر بھی وقتاً فوقتاً بعض ایسے نام سامنے آئے جنھوں نے اُردو ناول نگاری کو ترقی دینے میں اپنی بھرپور صلاحیت کا اظہار کیا۔

اگر ناول نگاری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمارے سامنے پنڈت سالگرام سالکؔ اور منشی محمد الدین فوقؔ کے نام فوراً ذہن میں آجاتے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے اوائل میں اُردو ناول نگاری کے فن کی سنگِ بنیاد ڈالی۔ سالکؔ کا ''داستان جگت روپ'' اور فوقؔ کا ''اکبر اور انارکلی'' اگرچہ نیم تاریخی داستانیں ہیں لیکن اُن میں ناول نگاری کی تکنیک اور فن کے ہلکے پھلکے نقوش ملتے ہیں۔ اس دوران ریاست جموں وکشمیر سے بعض ایسے اخبارات جاری ہونے شروع ہوئے جنھوں نے اپنے صفحات خبروں کے علاوہ ادب کے لیے بھی وقف رکھے اور اس طرح سے شعروادب کے مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں کے ناول بھی قسط وار اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ اس دور کا اہم ناول نگار پنڈت نندلال در بے

غرض کو تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے ''تازیانۂ عبرت'' کے نام سے اپنا ناول لکھ کر اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی ۔ بے غرض ، رتن ناتھ سرشار سے بے حد متاثر تھے ، اس لیے اُن کے ناول میں بھی یہ رنگ بخوبی جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔

آزادی کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں ناول نگاری کے دور کو زرین دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ اس دور میں ناول نگاری کے شعبے میں خاصی پیش رفت ہوئی ۔ بعض اہم اور قابلِ قدر ناول نگار سامنے آئے جنھوں نے ادب کے اس شعبے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ۔ ان ناول نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی کا نام لیا جاسکتا ہے ۔ پردیسی کو اگر چہ اُردو کا عظیم افسانہ نگار تصور کیا جاتا ہے لیکن بقول ڈاکٹر برج پریمی انھوں نے ''پوتی'' کے نام سے ایک ضخیم ناول بھی لکھا ، جو تقسیم کے دوران تلف ہوگیا ۔ پردیسی کے بعد جو ناول نگار سامنے آئے اُن میں راما نند ساگر ، نرسنگھ داس نرگس ، کشمیری لال ذاکر ، ٹھاکر پونچھی ، تیج بہادر بھان ، غلام رسول سنتوش ، مدن موہن شرما ، علی محمد لون ، حامدی کاشمیری ، نور شاہ ، مالک رام آنند ، شبنم قیوم وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کی کوششوں اور کاوشوں سے بعض اہم ناول منصۂ شہود پر آئے اور ناول نگاری کی صنف کی ترقی و ترویج میں اضافہ ہوگیا ۔ دوسرے دور کے ناول نگاروں میں کرن کاشمیری ، صوفی محی الدین ، فاروق رینزو ، آنند لہر ، جان محمد آزاد ، بھوشن لال بھوشن ، وجے سوری اور ڈی . کے . کنول وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں ۔ ان لوگوں نے بھی اپنے تخلیقی فن سے ناول نگاری کو فروغ دینے میں اپنی بھرپور صلاحیت کا اظہار کیا لیکن اس کے باوجود بھی ناول نگاری کے میدان میں وہ پیش رفت نہیں ہوئی جس کی توقع نثر کے اس طاقت ور شعبے سے کی جاسکتی تھی ۔ ایسے میں آنند لہر کا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ایک مبارک قدم ہے ۔

آنند لہر کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ وہ بہ یک وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈراما نگار بھی ، شاعر بھی ہیں اور تمثیل نگار بھی ۔ ان تمام شعبوں میں اُنھیں خاصی قدرت حاصل ہے لیکن گذشتہ کئی برسوں سے اُن کے افسانوں کے ساتھ ساتھ بعض ایسے ناول بھی سامنے آئے جو سنجیدہ ادبی و علمی حلقوں میں خاصے بحث کا موضوع بن گئے ۔ ''اگلی عید سے پہلے'' اور

''سرحدوں کے بیچ'' کے بعد ''مجھ سے کہا ہوتا'' اُن کا ایک اور کامیاب ناول چھپ کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے ایک نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ناول میں کوئی انسانی کردار نظر نہیں آ رہا ہے بلکہ ناول نگار نے جانوروں اور پرندوں کی گفتگو سے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس طرح کی کوششیں اگرچہ پہلے بھی ہو چکی ہیں جن کی طرف پروفیسر ظہور الدین ۔نے ناول کے سرنامے میں اشارہ کیا ہے۔ لیکن آنند لہر ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں اپنی بات نئے اور انوکھے انداز میں لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اس دُنیا میں ہونے والی زیادتیوں، ظلم و تشدد، بربریت، جنگ و جدل اور خوں ریزی کو اپنا موضوع بنایا ہے اور خوبصورت الفاظ، مناسب تراکیب اور علامتوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کو کاغذ پر انڈیلا ہے۔ افتخار امام صدیقی ایک جگہ میری اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آنند لہر نے اپنے نئے ناول میں ایک ایسا موضوع کینوس کیا ہے جو حساس بھی ہے اور خطرناک بھی۔ وہ اپنے اس چوتھے افق پر ایک نئے تجربے کو روشن کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو کم از کم اُردو میں بالکل نیا ہے۔''

آنند لہر ایک حساس فنکار ہیں۔ وہ دراصل عراق اور امریکہ کی جنگ سے ہونے والی تباہ کاری سے متاثر ہوئے ہیں۔ اسی لیے انسانیت کا خون، فاقہ کشی، قحط سالی کے ساتھ ساتھ ملکوں کا آپسی تناؤ اور ٹکراؤ، طاقتور بننے کے لیے غریب اور پسماندہ قوموں کا استحصال اور ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں کے استعمال سے دُنیا میں پیدا ہونے والے مسائل، قدرتی وسائل کی کمی، ماحول کی آلودگی اور کئی ایسے سوالات ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں اُبھرتے ہیں۔ یہ تمام سوالات نہ صرف ایک انسان سے جواب طلب کرتے ہیں بلکہ عالمِ انسانیت پر چوٹ بھی کرتے ہیں۔ آنند لہر نے ان مسائل کو پہلی بار محسوس کیا ہے اور اپنے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں طنزیہ لب و لہجے میں ان تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین ناول کے سرنامے میں ان تمام مسائل کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یہ ناول اگرچہ امریکہ کے ہاتھوں عراق پر نازل ہونے والی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن یہ ایسے بہت سے انسانی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً ملکوں کے آپسی رنجش، نسلی امتیازات، انسانی رشتوں کا زوال اور اُن کی بے حرمتی، طاقت کا غلط استعمال، امیر قوموں کے ہاتھوں غریب قوموں کا استحصال، انسان کی کم ظرفی، خودغرضی، بارود کے دھوئیں سے زمین پر نازل ہونے والی تباہیاں، ماحولیاتی کثافتیں، ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ اور اُن سے پیدا ہونے والے خطرات وغیرہ۔''

آنند لہر انوکھے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرنے میں کوئی جواب نہیں رکھتے۔ وہ کائنات کی ہر شے پر نظر رکھتے ہیں۔ مختلف مسائل پر غور کرنا بچپن سے ہی اُن کا خاصا رہا ہے۔ اسی لیے اُن کی تخلیقات میں ملکوں کا سیاسی تناؤ اقتصادی بدحالی، سماجی پسماندگی، نسلی امتیازات جیسے موضوعات پر بحث ملتی ہے۔ زیرِ نظر ناول بھی ایک ایسے ہی موضوع پر لکھا گیا ناول ہے جو آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان حرص و ہوس کا شکار ہو گیا ہے۔ اُس کو دولت اور صرف مزید دولت کی ضرورت ہے۔ جنگلات سوکھ کر راکھ ہو جائیں یا پھول آگ کی چنگاریوں میں تبدیل ہو جائیں، زمین سے بارود کی بُو آجائے یا سمندر خشک ہو جائیں، انسانیت کا قتل ہو جائے یا مِلوں اور فیکٹریوں سے پھیلی ہوئی زہریلی گیس سے انسان کا دم گھٹ جائے۔ یہ تمام مسائل انسان کو سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ آنند لہر نے بھی ان مسائل پر غور و خوص کیا ہے اور پھر اپنے قلم کی نوک سے مناسب الفاظ کا جامہ پہنا کر پڑھنے والوں کے سامنے لایا ہے۔

آنند لہر جدیدیت سے بہت زیادہ مرعوب نہیں بلکہ وہ روایت کی پاسداری بھی رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے انسانیت کے نازک اور حساس پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے اور خاطر خواہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ ناول ''مجھے کہاں ہے جانا'' ساری عالم انسانیت پر گہری چوٹ ہے۔ ناول نگار کا کمال یہ

ہے کہ اُنھوں نے جانوروں اور پرندوں میں غور وفکر کرنے کا مادہ عطا کیا ہے۔ اُن کے نزدیک انسان حد درجہ لالچی، خودغرض اور مکار بن گیا ہے۔ تنگ نظری، حسد، بغض اور حرص وحوس نے اُن کو اندھا بنا کے رکھ دیا ہے۔ اسی لیے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں ملکوں کے آپسی تناؤ اور ٹکراؤ کی کہانیاں ملتی ہیں۔

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' میں چڑیا، طوطا، کوّا، کُتا، چیل، خرگوش، شیر، ہاتھی، چوہا، بلبل، سانپ اور ریچھ وغیرہ جیسے کرداروں کی زبردست اہمیت ہے۔ ناول نگار نے گل، ساحل، سمندر، پانی اور ہوا میں بھی گفتگو کرنے کی قوت عطا کی ہے۔ یہ تمام چیزیں بخوبی اپنا پنا فرض نبھانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس ناول کے مکالمات بھی چست ہیں، زبان صاف اور سادہ اور واقعات میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ ناول کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

☆ ''کیوں کہ وہ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹے رہتے ہیں۔ وہ رائے کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ کس ملک کا نمائندہ رائے دے رہا ہے، جو رائے دے رہا ہے، اُس ملک کے پاس ایٹم بم کتنے ہیں ہائیڈروجن بم کتنے ہیں۔''

☆ ''وہ ایسے کہ انسان نے جنگل کاٹے، جانور مارے اور زمین کو ریگستان میں بدلا۔''

☆ ''انسان تو ہتھیار جمع کرتا ہے، بارود جمع کرتا ہے، یعنی کہ خون کا ذخیرہ کرتا ہے۔''

☆ ''مگر کتنا بدقسمت ہے انسان جو زمین کے لیے لڑتا ہے، جو کبھی بٹ نہیں سکتی اور جو زبانیں اور مذہب زمین کو خوبصورت بناتے ہیں، اُن کے لئے لڑتا ہے۔''

☆ ''ایک آدمی کو مارنے کے لیے یہ زمین تباہ کی گئی، یہ ٹینک چلائے گئے، ہوائی جہازوں سے بم گرائے گئے۔ رشتے ختم کیے گئے۔ لگتا ہے انسانی عقل جانوروں سے بھی کم ہوگئی ہے۔''

آنند لہر کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ وہ بات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کے قائل

ہیں۔اُن کے ہاں نہ تو دُور از کار تراکیب ملتی ہیں اور نہ وہ بے مطلب واقعات کو خاطر میں لانے کے حق میں ہیں۔ رواں دواں عبارت نے اُن کے ناول میں دلچسپی کا عنصر پیدا کیا ہے۔ واقعات کو موثر بنانے کے لیے آنندلہر نے علامتوں سے بھی کام لیا ہے۔ وہ زمانے کے سرد و گرم سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے زیرِ تبصرہ ناول میں جذبے کی صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' آنندلہر کی منفرد اور قابلِ تحسین کوشش ہے۔

میں آنندلہر کو یہ کامیاب ناول لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

# گریاں جھوٹ بولتا ہے

ہرچرن چاولہ

''گریاں جھوٹ بولتا ہے'' اُردو کے معروف کہانی کار ہرچرن چاولہ کا تازہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اِس سے پہلے اُن کے سات افسانوی مجموعے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ چاولہ کے تین ناول بھی چھپ چکے ہیں اور اپنی یادوں پر مشتمل اُن کی خودنوشت سوانح ''البم'' کے نام سے آج سے چھ سال قبل منظرِ عام پر آچکی ہے۔ اس طرح سے وہ بہ حیثیتِ ناول نگار، افسانہ نگار اور سوانح نگار کے یکساں قدرت رکھتے ہیں لیکن افسانہ نگاری میں انھیں خاصی قدرت حاصل ہے۔

ہرچرن چاولہ تین دہائیوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں[1]۔ اُن کے افسانے ملک اور بیرونِ ملک نمائندہ رسائل وجرائد میں شائع ہوکر پسند کیے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز اور منفرد ڈکشن کی وجہ سے نئے افسانوی سفر میں پیش پیش ہیں۔

سالِ رواں کے دوران لاہور سے شائع ہونے والی کہانیوں کے مجموعے ''ڈھائی اکھر'' کے بعد ''گریاں جھوٹ بولتا ہے'' ہرچرن چاولہ کی کہانیوں کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی تقریباً بیس کہانیاں اور گیارہ منی کہانیاں شامل ہیں جن میں ''گریاں جھوٹ بولتا

---

1. ہرچرن چاولہ ٦ر دسمبر ۲۰۰۱ء اوسلو (ناروے) میں انتقال کر گئے۔

ہے''، ''قفس''، ''بیوی اور بیماری''، ''پسِ دیوار''، ''سانپوں کا جوڑا''، ''دریا اور کنارے''، ''انگارہ''، ''دھائی اکھر''، ''زخموں کے سوداگر'' اور منی کہانیوں میں ''مکتی پتھ''، ''عورت''، ''دائرہ''، ''نتیجہ''، ''کبیرا ہنسا بھی اور رویا بھی'' وغیرہ نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں۔

چاولہ کے ان افسانوں کا موضوع خاص زندگی کی حقیقی تصویر کشی ہے، وہ جھوٹ اور کذب و افترا سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کی نگاہیں نہ صرف انسان کے بے فکر لمحات پر ہی رہتی ہیں بلکہ وہ اس کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور ساری انسانیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ انسان کے مسائل، اُن کا درد و کرب اور اُن کے مصائب و مشکلات کا چاولہ کو بخوبی اندازہ ہے۔ اُن کی کہانی آج کل کے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے انسان کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کا مشاہدہ تیز اور مطالعہ وسیع ہے۔ چاولہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے قائل ہیں۔ ان کے کردار چلتے پھرتے کردار ہیں۔ یہ کردار ایسے سچے اور کھرے ہیں کہ حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

ہرچرن چاولہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُردو کی بستی سے دور سرزمینِ ناروے میں برس ہا برس سے اقامت پذیر ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اُردو سے محبت کرتے ہیں اور ہندوستان کی تہذیب، ثقافت اور کلچر کی اپنے افسانوں میں پوری عکاسی کرتے ہیں اور یہ اُن میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے۔ جناب ہیرانند سوز نے ''گریبان جھوٹ بولتا ہے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ:

> ''ہرچرن چاولہ کے فکری رویے ملکوں اور قوموں کی حد بندیوں سے بے نیاز ہیں۔ وہ صرف انسانی قدروں کے علمبردار نظر آتے ہیں۔''

''گریباں جھوٹ بولتا ہے'' ادارۂ فکرِ جدید، نئی دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے۔ اعلیٰ کتابت، عمدہ کاغذ اور نفیس طباعت سے یہ مجموعہ مالا مال ہے۔ قیمت صرف ڈیڑھ سو روپے ہیں جو بالکل مناسب ہے۔

# تلافی

ڈاکٹر ظہور الدین

پروفیسر ظہور الدین ایک محقق اور نقاد کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ اُردو کے مختلف موضوعات پر اُن کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں داد حاصل کر چکی ہیں۔ اُردو ڈرامے پر بھی اُن کا خاصہ کام ہے اور جموں و کشمیر کی اُردو ادبی تاریخ پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ظہور صاحب ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور شعر کے وسیلے سے بھی اپنے دِل کا درد کاغذ پر اُنڈیلتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک افسانہ نگار ہیں۔ ''تلافی'' اُن کا اوّلین افسانوی مجموعہ ہے، جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔

پروفیسر ظہور الدین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۱ء میں ''تلافی'' کے عنوان سے ایک خوبصورت افسانے سے کیا۔ اِس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے اور اپنے افسانوں میں نئے رنگ بھرتے رہے۔ ''تلافی'' میں شامل افسانے رنگوں کی اُسی قوسِ قزح کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مجموعے کے پیش لفظ میں ظہیر فرید آبادی لکھتے ہیں:-

> ''ظہور صاحب بذاتِ خود جس قدر سنجیدہ اور کم گو ثابت ہوئے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں بھی اُسی قدر اِختصار موجود ہے۔ اُن کے کردار کھردرے، پراگندہ اور کمزور ہوتے ہوئے بھی اپنی کمزوریوں کو خود فاش کر دینے کی قوت رکھتے ہیں۔''

پروفیسر ظہور الدین ایک حساس فنکار ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں ایک عجیب طرح کے درد و کسک کا احساس ہوتا ہے۔ ''تلافی'' کے اکثر افسانوں کا موضوع اگرچہ دُکھ درد، بھوک، اَفلاس اور سماجی پسماندگی ہے لیکن اِن تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں عشق و محبت کی تب وتاب بھی جا بجا ملتی ہے۔ ''تلافی'' میں شامل افسانے سیدھے سادے افسانے ہیں۔ اُن میں سے اکثر افسانے تقسیمِ ملک کا المیہ پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ افسانے اُن کی طالب علمی کے زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں لیکن ظہور صاحب کے قلم میں اِتنی طاقت اور توانائی ہے کہ ان افسانوں کا شروع سے آخر تک وحدتِ تاثر قایم رہتا ہے۔ ''تلافی'' بذاتِ خود ایک علامت ہے اُس نقصان کی، جس کا خمیازہ تقسیم کے بعد بھی آج تک اِنسان بھگت رہا ہے۔ ظہور الدین جیسے افسانہ نگار بھی اِس المیے سے دوچار ہیں۔ اُن کا قلم بھلا کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ''دوچوڑیاں''، ''سودا''، ''تین سوال''، ''قاتل''، ''لیکریں'' جیسے اُن کے افسانے تقسیم کا منظرنامہ پیش کرتے ہیں۔ اُن کے اِس قبیل کے افسانوں میں فسادات کی تباہی وبربادی کی داستان منقش ہے۔ چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے، جن سے یہ درد کُھل کر سامنے آتا ہے، مثلاً:

> ''پھر اچانک فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور
> بٹوارہ ہوگیا تھا۔ صرف ملک کا ہی نہیں، ہمارے گھر کا بھی، ابا جان
> پاکستان (میں) چلے گئے تھے اور میں ماں کے ساتھ یہیں رہ گیا تھا۔''
>
> (تین سوال)
>
> ''سنتالیس کے بعد دو خطوط تحریر کر چکا ہوں، پرانے
> گاؤں کے پتہ پر۔ لیکن کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ معلوم نہیں تم اَب بھی
> وہاں ہی رہائش رکھتے ہو یا کہیں اور جا بسے ہو۔ باقی گاؤں والوں میں
> سے کون کون بچا اور کس پر کیا کیا سنتالیس میں بیتی، خدا بہتر جانتا ہے۔
> اور جو مجھ پر گذری ہے وہ پہلے خط میں تحریر کر چکا ہوں۔ تمام کنبہ غدر کی
> بھینٹ کر آیا ہوں۔''
>
> (سودا)

تقسیمِ وطن کے اَلمیے کو اُردو کے بیشتر افسانہ نگاروں نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ جن میں منٹو، کرشن چندر، خواجہ

احمد عباس ،احمد ندیم قاسمی اور راجندر سنگھ بیدی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر ظہورالدین نے اُن افسانہ نگاروں کا بڑے خلوص سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ اُن کے فن پاروں سے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے افسانوں میں توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔

پروفیسر ظہورالدین اگرچہ خطّہ جموں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اُن کے افسانوں میں زیادہ تر کشمیر کے سرسبز اور شاداب باغوں، حسین پربتوں، جھر جھر کرتے ہوئے جھرنوں اور خوبصورت کھیتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ''تلافی'' میں شامل افسانوں میں بنڈ، چشمہ شاہی، ڈل، شنکرآچاریہ، دریائے جہلم، بڈشاہ پل، لال چوک، ڈل گیٹ، مہاراجہ بازار جیسے مقامات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا کہ افسانہ نگار نے اپنی زندگی کے بہترین ماہ وسال سری نگر میں گذارے ہیں۔ سری نگر کے اُن مقامات سے اُنہیں گہری دلچسپی رہی ہے۔ وہ کبھی ڈل کی خنک ہواؤں سے مسحور ہوتے ہیں اور کبھی شنکرآچاریہ کی چوٹی پر چڑھ کر ساری وادی کا نظارہ کرنے لگتے ہیں۔ کبھی بڈشاہ پُل کی چڑھائی کا سامنا کرنے سے پہلے ہی سائیکل سے اُتر جاتے ہیں اور اُس برہنہ عورت سے دوچار ہوتے ہیں جو اُن کے مخالف سمت سے اچانک نمودار ہوتی ہے، اور کبھی ٹیگور ہال کے نزدیک خانہ بدوش قافلہ کا جایزہ لینے لگتے ہیں۔ کبھی مہاراجہ بازار کی دُکانوں کی حفاظت کرتے کرتے اُونگھ جاتے ہیں اور کبھی نیشنل ہائی وے بند ہو جانے سے میلوں پیدل چلنے لگتے ہیں۔ اُن کے افسانے ''آنسو'' کا اِقتباس ملاحظہ ہو، جس میں کشمیر کا سارا حُسن اُمڈ آیا ہے:-

> ''شنکرآچاریہ کی چوٹی پر چڑھ کر اِس وادی پر نظر دوڑاؤ تو ایسا لگتا ہے جیسے زمین کا ایک بڑا خِطّہ چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹا ہوا ہے۔ اُونچے اُونچے مکانوں کے ساتھ اُگے ہوئے بھید و چنار کی (کے) درخت بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ڈل میں ترتیب سے سجے ہوئے ہاؤس بوٹ اور اُن میں ٹمکتے ہوئے قمقے۔ اُن کا جھیل کے صاف و شفاف پانی میں جھلملاتا ہوا عکس اِنسان کو کسی دُوسری ہی دُنیا میں پہنچا دیتا ہے۔''
>
> (آنسو)

پروفیسر ظہورالدین کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اِردگرد کے ماحول سے پلاٹ

اَخذ کرتے ہیں۔ کردار نگاری میں بھی وہ کمال رکھتے ہیں۔ یہ کردار جانے پہچانے ہیں۔ ''تلافی'' کے افسانوں میں بعض اہم اور جاندار کردار سامنے آتے میں جو اِن افسانوں کا حُسن دوبالا کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے افسانوں ''جب بادل گرجیں گے'' میں لالی کا کردار، ''سودا'' میں قادر چاچا، ''آنسو'' میں ریشماں ''ڈھلکا بدن'' میں سادھو مہاراج اور ''تلافی'' میں رامو جیسے کردار اپنے پورے شد و مد کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔ یہ کردار زندہ اور جاوید ہیں، جو اِن افسانوں کے شروع سے آخر تک آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔

''تلافی'' ۱۷۱ر صفحات پر مشتمل پروفیسر ظہور الدین کا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں اُن کے ۱۶ر افسانے شامل ہیں۔ اِن افسانوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں راہ پاگئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظہور صاحب نے پرُوف ریڈنگ کی طرف خاص توجہ نہیں کی ہے۔ آج سے تقریباً ۳۴ر سال قبل لیتھو پر شائع ہوئے اِن اَفسانوں کا گیٹ اَپ غنیمت ہے۔

# ادھورے چہرے

## دیپک بدکی

دیپک بُدکی کا شمار اگرچہ تازہ دم اَفسانہ نگاروں میں ہوتا ہے لیکن ان کا فن شروع سے ہی جوان لگتا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''سلمیٰ'' کے نام سے روزنامہ ''ہمدرد'' سرینگر کے اَدبی ایڈیشن میں شائع ہوا، جسے سنجیدہ اَدبی حلقوں نے کافی سراہا۔ بظاہر یہ ایک ہلکا پھلکا افسانہ ہے، جس میں دو محبت کرنے والے دِلوں کی دھڑکن محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد ان کے بہت سے افسانے منظرعام پر آئے جو دِلچسپ بھی ہیں اور توجہ طلب بھی۔ رفتہ رفتہ وہ عصرِ حاضر کے درد و کرب کو صفحۂ قرطاس پر اُتارنے لگے اور ایسی منزل پر پہنچ گئے جہاں جدید اور روایتی افسانے کی سرحدیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن اُنہوں نے اُس راہ کو متعین نہیں کیا جو جدید افسانے کے نام پر قاری کو گمراہ کرتا ہے بلکہ انہوں نے ایسے افسانے لکھے جن میں کہانی پن کا احساس اپنے پورے شدومد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بعض ایسے افسانے بھی لکھے جن میں طنزیہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ وہ نہ صرف ایک فرد پر طنز کے تیر برساتے ہیں بلکہ سوسایٹی پر بھی طنز کرتے رہے اور کبھی کبھی حکومت کو بھی انہوں نے طنز و تضحیک کا نشانہ بنادیا۔ ان کے بعض افسانے ایک زمانے میں 'گیان ساگر' کے فرضی نام سے بھی شائع ہوتے رہے اور اپنے طنزیہ لب و لہجے کی وجہ سے بہت ہی مقبول ہوئے۔

''ادھورے چہرے'' دیپک بُدکی کے سولہ افسانوں پر مشتمل ایک خوبصورت مجموعہ ہے، جو اُن کے پختہ ذہن اور گوناگوں زندگی کے تجربات کی دلالت کرتے ہیں۔ دیپک شروع سے ہی شاعرانہ ذہن لے کے آئے تھے۔ وہ مصوّر بھی ہیں اور کارٹونسٹ بھی، لہٰذا اِن دونوں فنون کا تانا بانا ان کے افسانوں

میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان کے اکثر افسانوں میں ایسے کردار نظر آتے ہیں، جو بہت ہی ملائم اور نازک طبیعت کے مالک ہیں۔ جن کا کام برش سے رنگ آمیزی کرنا ہے اور فطرت کے ہزار ہا جلوؤں کو کاغذ پر اُتارنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیپک خود وادیٔ کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں، جہاں قدرت کے بے شمار رنگ ہیں اور پھر فوج کی ملازمت کے دوران اُنہیں ایسے مقامات کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا جہاں دھرتی کی گود میں فطرت کے تمام کرشمے سمٹ کے آئے ہیں، لہٰذا اُن کی کہانیاں حُسن کی کہانیاں ہیں۔ جن میں بناوٹی حُسن نہیں بلکہ قدرتی حُسن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

دیپک جدید افسانے کی رو میں نہیں بہے بلکہ ان کے فن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے بے مطلب قصّے رقم نہیں کئے اور نہ ہی داستان طرازی کی ہے بلکہ اپنی صاف اور سلیس زبان میں انہوں نے اپنے افسانوں میں حسن اور نزاکت پیدا کی ہے۔ ان کے افسانے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کہانی اپنے ساتھ لے کے آئے تھے۔ اِسی لئے وہ کہانی میں کہانی پن کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں لفاظی نہیں بلکہ الفاظ کے ساتھ ساتھ معنی و مفہوم کا رشتہ بھی اہمیت رکھتا ہے اور یہی چیز اُنہیں ان کے معاصرین میں ایک الگ اور اِنفرادی حیثیت عطا کرتی ہے۔ ڈرفٹ وڈ، اَدھ کھلی اور رِشتوں کا درد جیسے افسانوں میں یہ تمام خوبیاں سمٹ کے آئی ہیں۔

دیپک بُدکی کے افسانوں میں جگ بیتی کم اور آپ بیتی زیادہ ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مختلف کہانیاں نہیں ہیں بلکہ ان میں اِتنا توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے کہ یہ مسلسل اور مربوط کہانی لگتی ہے جو مختلف کرداروں کے ذریعے سے مختلف منزلوں سے گزرتی ہوئی نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ ڈرفٹ وڈ، بٹی ہوئی عورت، خودکشی، کالا گلاب اور ادھورے چہرے، وغیرہ افسانے اِس ضمن میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

دیپک بُدکی نے اپنے افسانوں میں اِنسانی زندگی کے بہت سے پیچیدہ مسائل کو جس خوبی کے ساتھ اُبھارا ہے، وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ ان افسانوں میں زیادہ تر اُن کے ذاتی تجربے شامل ہیں۔ یہ تجربے بڑے تلخ تجربے ہیں جو صرف اُن کی ذاتی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ قدرت نے اُن کے ساتھ ہر موڑ پر آنکھ مچولی کھیلی ہے اور وہ سراب در سراب میں سے گزر کر ایک ایسے موڑ پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں محرومی، لاچاری اور بے کسی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نازک اور حساس فنکار نے

زندگی سے منہ نہیں موڑا بلکہ زمانے کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی اُلجھنوں اور پریشانیوں کا زہر مسکراتے ہوئے پی لیا۔ اگر چہ زندگی کے ہر موڑ پر انہیں شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اُنہوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ وہ اپنے درد کو کاغذ پر اُنڈیلنے لگے۔ اِسی لئے ان کی کہانیاں معنی خیز ہیں اور ان میں زندگی کے پیچیدہ تجربات کا کُھل کر اظہار ملتا ہے۔

دیپک بُدکی افسانے کے فن سے واقف ہیں۔ اُنہوں نے پریم چند، منٹو، کرشن چندر اور اشک کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے نمائندہ افسانہ نگاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن یہ خوش آئند بات ہے کہ انہوں نے کسی گروپ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہیں کیا بلکہ اپنے لئے بیچ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ دیپک کا فن روایتی اور جدید افسانے کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ خود ایک جگہ اپنے قلئے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''میں کہانیاں اِس لئے اختراع نہیں کرتا کہ کسی ادبی گروپ کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ کر اپنی پہچان بنالوں۔ بلکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ ادیب کی شخصیت آفاقی ہوتی ہے جزیاتی نہیں۔ قارئین کو اپنی گرفت میں لینے کی مہارت اگر اس میں موجود ہے تو وہ بنا کسی پہل کے اپنی شناخت قائم کرسکتا ہے۔''

دیپک کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ وخم نہیں بلکہ وہ براہِ راست اپنی بات دُوسروں تک پہنچانے کے قائل ہیں۔ ان کی زبان میں فارسیت کا غلبہ نہیں۔ اُنہوں نے خوشنما ہندی الفاظ کا سہارا لے کر اپنے افسانوں میں رنگ آمیزی کی ہے البتہ ان کے مکالمے چست نہیں ہیں۔ بعض افسانوں میں بے تحاشہ انگریزی الفاظ پائے جاتے ہیں، جن سے افسانہ نگار کو گریز کرنا چاہئے تھا۔ اس افسانوی مجموعے میں بہت ساری غلطیاں راہ پاگئی ہیں۔ اگر چہ افسانہ نگار نے مجموعہ کے آخر میں پانچ صفحات پر مشتمل اغلاط نامہ بھی چسپاں کیا ہے، جس میں ۱۰۶ غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود زیر تبصرہ مجموعے میں بے شمار غلطیاں نظر آرہی ہیں جن سے بعض افسانوں کا حُسن مجروح ہوگیا ہے۔ دیپک شروع سے ہی سائنس کے طالب علم رہے ہیں اور پھر آئی. پی. ایس کر کے فوج اور اس کے بعد محکمہ ڈاک میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے، جہاں اُردو شعر وادب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن اس کے باوجود اُن

کے افسانے قابل مطالعہ ہیں۔اگر وہ اسی طرح لکھتے رہے اور کہانی میں پلاٹ سازی اور کردار نگاری کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر اپنی ساری توجہ مرکوز کرتے رہے تو عنقریب ہی اُردو افسانہ نگاری کے اُفق پر ایک اور نام کا اضافہ ہوسکتا ہے۔بہر حال ''ادھورے چہرے'' ایک باصلاحیت افسانہ نگار کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔

# ہزاروں غم

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا اَدبی سفر طویل نہیں لیکن جس محنت ،لگن اور صلاحیت سے وہ اپنی کہانیوں سے اِس سفر کو رونق بخشتے ہیں ،وہ قابل ستائش ہے۔ اِس مختصر سے عرصے میں اُنہوں نے بعض اچھی کہانیاں لکھیں اور مختلف رسایل واخبارات نے اُن کہانیوں کو شائع کر کے اِس نئے قلمکار کا سواگت کیا۔ اِس طرح سے اِس جواں سال افسانہ نگار کے حوصلے بلند ہوئے اور کہانیاں تخلیق کرنے کی طرف اُن کی دِلچسپیوں میں روز افزوں اِضافہ ہوتا گیا۔ ''ہزاروں غم'' اُن کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ ہے۔ سولہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ ''ہزاروں غم'' میں رومانٹک افسانے بھی ملتے ہیں اور سیاسی اور سماجی موضوعات پر افسانے بھی۔ اِن افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتاق زندگی کے تلخ تجربات سے گذرے ہیں۔ اُنہیں قدم قدم پر محرومیوں اور لاچاریوں کے سایوں نے گھیر لیا ہے۔ وہ ضلع ڈوڈہ کے مرمت (بھلیسہ) جیسے پچھڑے ہوئے علاقے میں پیدا ہوئے۔ یہ علاقہ اگر چہ سال ہا سال سے تعلیمی ،معاشی اور اِقتصادی بحران کا شکار رہا ہے لیکن یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ اُس علاقے کے لوگ بڑے محنتی ہیں اور صدیوں سے روایتی بھائی چارے کی مشعل جلائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مشتاق کا شعور اُسی ماحول میں پروان چڑھا اور یہی سادگی اور معصومیت اُن کے افسانوں میں بھی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خود اپنے علاقے کے بارے میں اپنے ایک افسانے ''اجنبی دو دِل اجنبی'' میں لکھتے ہیں:-

''میں ضلع ڈوڈہ کے ایک پسماندہ علاقہ بھلیسہ میں

پیدا ہوا ہوں اور جب کہ تم اودھم پور کے قصبہ رام نگر میں پیدا ہوئی ہو۔
مجھے بھلیسہ چھوڑے ہوئے پانچ سال ہوگئے ہیں۔ میرا بچپن میرا
لڑکپن وہیں گزرا ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں پل کے جوان ہوا
ہوں۔کیا تم یقین کروگی کہ میں نے بھیڑ بکریاں چرائی ہیں اور اپنی
ماں کے حکم پر گوبر سے بھری ٹوکریاں کھیتوں میں پہنچائی ہیں۔''

''ہزاروں غم'' کے افسانوں کا تانا بانا یہی سیاسی اور اقتصادی بحران ہے جسے مشتاق کے قلم نے زبان دے کر قارئین کے سامنے لایا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق کے افسانوں کا موضوع بھوک' افلاس' سماجی پسماندگی، ظلم، تنگ دستی' محرومی اور لاچاری ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کار خود شروع سے ہی ذہنی تناؤ اور معاشی بدحالی کا شکار رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے سڑکوں پر پتھر توڑنے کا کام بھی کیا اور کھیتوں میں ہل بھی چلایا۔ بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کا کام بھی کرتے رہے اور پنچایت گھر میں جھاڑو بھی دیتے رہے۔ اور ان تمام چیزوں کو وہ اپنے افسانوں میں مختلف کرداروں کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچانا عار نہیں سمجھتے بلکہ اپنی زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اِسی لئے مشتاق کی بیشتر کہانیوں میں زندگی کے تلخ حقایق کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور یہی ایک حقیقی فنکار کی پہچان ہے۔اُردو کے معروف افسانہ نگار امین بنجارا ''ہزاروں غم'' میں شامل کہانیوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''ہزاروں غم'' کی اکثر کہانیاں ایسی ہیں جو زندگی سے
جڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔
اِن کہانیوں کا آغاز بڑے عام فہم اور سہل انداز میں ہوتا ہے اور
واقعات کا تسلسل قاری کو اپنے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان
کہانیوں کی یہ کشش اس بات کی دلیل ہے کہ مشتاق احمد وانی کو کہانی
بُننے کا فن آتا ہے۔''

(ہزاروں غم۔ ص ۱۰)

ڈاکٹر مشتاق کہانیوں کے مطالعے سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اردو ناول میں تہذیبی بحران
کے موضوع پر قابلِ قدر کام کر چکے ہیں۔ [illegible]

ساتھ مقامی کہانی کاروں میں سے برج پریمی، پشکر ناتھ، موہن یاور اور ٹھاکر پونچھی کی تخلیقات اُن کے زیرِ مطالعہ رہی ہیں۔ اسی لئے اُن کے افسانوں میں کہانی پن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ قاری کو جدید افسانے کے نام پر گمراہ نہیں کرتے بلکہ اپنی بات آسان اور عام فہم زبان میں کہنے کے روادار ہیں۔ اُن کے ہاں تسلسل پایا جاتا ہے اور یہی تسلسل اُن کے افسانوں میں ایک نئی رُوح پھونک دیتا ہے۔ چند افسانوں کے اِقتباس ملاحظہ ہوں، جن سے افسانہ نگار کی صلاحیتوں کا بھر پور احساس ہوتا ہے:۔

''ہم آج تک ایک دُوسرے کے لئے اجنبی تھے لیکن
ہ۔ اجنبی نہیں رہے۔ اَب ہم دو دِل ہیں' اس لئے اُٹھو، مسکراؤ.
رے قریب آؤ، مجھے اپنی بانہوں میں بھر لو، بھول جاؤ اپنا ماضی' حال
شیوں کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دو، دیکھو اَجنبیت کا پردہ ہٹاتے
تے رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ وقت بہت بے رحم ہوتا ہے۔ یہ
کسی کا انتظار نہیں کرتا، گھڑی کی سوئیاں وقت کے تابع ہیں۔ بے
چاری، بے بس و مجبور، مسلسل اپنا کام کئے جارہی ہیں۔ اِنسان کی
زندگی بھی اِن گھڑی کی سوئیوں کی طرح گزر جاتی ہے۔''

(اجنبی دو دِل اجنبی۔ ص ۲۴)

''یہی ناپاک نیت لے کر مراد حسین اپنے بستر سے
اُٹھ کھڑا ہوا۔ اِدھر اُدھر تا کا جھانکی کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بڑی
احتیاط کے ساتھ جان بی بی کی چار پائی کے پاس پہنچ گیا۔ اُس نے
کانپتے ہاتھوں سے جان بی بی کے چہرے پر سے چادر ہٹادی۔ جان بی
بی مست نیند کے عالم میں سوئی ہوئی تھی ۔ اُس بے چاری کو تو اُس
دِن کا اِنتظار تھا جب مراد حسین دولہا بن کر اُس کے گھر آئے گا اور جان
بی بی کو دُلہن بنا کر اپنے گھر لے جائے گا۔ اُسے تو اِس بات کی ذرا بھی
اُمید نہ تھی کہ مراد حسین بغیر نکاح و شادی کے اِنسانیت سوز حرکت
کرنے پر آمادہ ہوگا۔ مراد حسین نے جوں ہی جان بی بی کے چہرے پر

ہاتھ پھیرا تو وہ بیدار ہوگئی۔ مراد حسین نے جھٹ اُس کے کان میں سرگوشی کی۔"

(مکار۔ ص ۴۶)

مشتاق وانی کے فن کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں اپنے ہی دِل کی بات کہتے ہیں اور اپنے ماحول کو بخوبی پیش کرتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں کوئی پیچ وخم نہیں اور نہ وہ کسی فرضی قصے کو اپنی کہانیوں میں جگہ دیتے ہیں۔ وہ سچی اور کھری بات کہنے کے قایل ہیں۔ وہ نہ انگریزی تراکیب اور بندشوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اِس زبان کا سہارا لے کر اپنی علمیت ظاہر کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اُردو زبان سے بے پناہ عشق ہونے کی وجہ سے اِسی زبان کے سلجھے ہوئے الفاظ اور خوشنما تراکیب سے اپنے افسانوں میں جان پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق کے ہاں ایسے کردار ملتے ہیں جو اپنا رول بخوبی نبھانا جانتے ہیں۔ یہ کردار چلتے پھرتے کردار ہیں۔ "اجنبی دو دِل اجنبی" کی فرزانہ، "مکار" کی جانو اور مُراد حسین، "بھولی بھولی سی صورت" کی مریم، "بندر سے اُلوتک" کا متھرا داس، "شفاخانہ" کی رُوحی اور "تنہا پرندہ" کا مادھو، ہزاروں غم کے چند ایسے کردار ہیں جن کو افسانہ نگار نے نہایت ہی محنت اور صلاحیت سے اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ اِن کرداروں میں کہیں پر بھی مصنوعی پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ کہانی کو آگے لے جانے میں اور اِس کی فضا سازگار بنانے میں یہ کردار اہم رول ادا کرتے ہیں۔

مشتاق اپنے اِردگرد کے ماحول سے پلاٹ اَخذ کرنے کے عادی ہیں۔ اِسی لئے اُن کی کہانیاں ایک عام انسان کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں کڑکتی دھوپ میں پتھر توڑنے والے مزدور بھی نظر آتے ہیں اور کھیتوں میں ہل چلانے والے بھی۔ بے تحاشہ دولت خرچ کرنے والے بھی اور آدھی روٹی پر گذر بسر کرنے والے بھی، شاندار محلوں میں رہنے والے بھی اور گھاس کے جھونپڑوں میں سر چھپانے والے بھی۔ سماج کو کھوکھلا بنانے والے بھی اور مذہب کے نام پر خون خرابہ کرنے والے بھی۔ اِن تمام چیزوں سے مشتاق کی ذہانت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اُن کے افسانے "مکار"، "بھولی بھولی سی صورت"، "ہزاروں غم"، "توبہ"، "گردش"، "میں سوچتا ہوں"، وغیرہ اِس ضمن میں پیش کئے جاسکتے ہیں، مثلاً:۔

"ایک ... میں ... جھاڑو دینے گیا

تو میں نے وہاں پر ایک لڑکے اور لڑکی کو نزدیک سے دیکھا۔ جوں ہی
اُن کی نظر مجھ پر پڑی، اُن کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا اور وہ وہاں سے
کھسک گئے۔ وہ دونوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ ماں باپ نے اُنہیں
پڑھنے کے لئے اسکول بھیجا تھا۔
موجودہ زمانے کے لڑکوں اور لڑکیوں کی رفتار دیکھ کر
گروجی، میرا جی نہیں چاہتا کہ میں اپنی بیٹی سریت کو آٹھویں جماعت
سے آگے پڑھاؤں۔"

(میں سوچتا ہوں۔ ص ۱۱۱)

"میں اپنے احباب کی محفل سے نکل کر تمہارے مزار
پر آیا ہوں۔ سورج غروب ہو چکا ہے۔ قبرستان میں تاریکیوں کے
مہیب سائے پھیلتے جا رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے رات ہو جائے گی۔
شبینہ آج کی رات یہیں تمہاری قبر کے پاس بالکل تمہارے ساتھ
گزارنی ہے۔ میں اِسی ارادے سے یہاں آیا ہوں۔ میں تم سے دُور
نہیں ہوں اور نہ تم مجھ سے دُور ہو، بل کہ میں تمہارے پاس ہوں بالکل
تمہارے ساتھ۔"

(میں تجھے آواز دیتا ہوں۔ ص ۱۴۵)

مشتاق نے اپنے افسانوں میں تشبیہات واستعارات اور علایم سے بھی بخوبی کام لیا ہے اور اپنی بات کو زیادہ مؤثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اُن کی زبان کہیں کہیں لڑکھڑاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے بعض افسانوں نے بے جا طوالت اختیار کی ہے۔ بعض افسانوں میں شادی، جہیز، طلاق، ریپ اور عورت اور مرد کے ناجائز تعلقات بار بار نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی کہانی کے کردار اور ماحول کو بدل بدل کر دوہرایا جا رہا ہے۔ اس طرح کے عمل سے کہانی کار کو گُریز کرنا چاہئے۔ اِس سلسلے میں "اجنبی دو دِل اجنبی"، "تباہی کا دروازہ"، "بندر سے اُلو تک"، "ہزاروں غم" جیسے افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق کے افسانوں میں کہیں کہیں کمزور عبارت راہ پا گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار نے مندرجہ ذیل جملوں پر غور نہیں کیا ہے۔ اِس طرح کی عبارت سے اُن کے افسانوں کی ساخت اثر انداز ہوئی ہے اور ایک جملے کا دوسرے جملے کے ساتھ رابطہ ٹوٹ گیا ہے، مثلاً:-

☆ میرے قریب آؤ اور مجھے اپنی باہوں میں بھر لو۔ (اجنبی دو دِل اجنبی۔ ص ۲۴)

☆ درختوں کے پتے کھڑ کھڑا رہے تھے۔ (شفا خانہ۔ ص ۹۴)

☆ آج پھر میں قبرستان میں تمہارے مزار پر آیا ہوں۔ (میں تجھے آواز دیتا ہوں۔ ص ۱۳۳)

☆ اُن کے دماغوں پر ہر وقت مختلف حساب و کتاب کے رجسٹر لدے رہتے ہیں۔ (بتاہی کا دروازہ۔ ص ۱۴۶)

☆ متھرا داس کو میری واعظانہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ (بندر سے اُلو تک۔ ص ۱۷۸)

☆ مجھے اُس وقت اپنا آپ ایک مُردار جانور کی طرح معلوم ہونے لگتا ہے۔ (ہزاروں غم۔ ص ۱۸۹)

☆ اُس کا سب سے چھوٹا بھائی اور لواحقین سنسار کی چتا کو داغ دینے لگے۔ (گروش۔ ص ۱۸۶)

ڈاکٹر مشتاق کے افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' خوف و دہشت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ کتاب کے نام سے ہی غم اور پریشانی کی شدید لہر چاروں طرف گردش کرنے لگتی ہے۔ اس طرح سے سارا ماحول پراگندہ ہو جاتا ہے اور قاری عجیب طرح کی کشمکش میں گرفتار ہوتا ہے۔ مجموعے کے اِنتساب پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ انتساب کا پہلا حصہ یعنی راشدہ، رضا اور صبا کے نام ایک ایسے خوشگوار ماحول کو پیش کرتا ہے جو بذاتِ خود ایک مکمل، مربوط اور معنی خیز ہے لیکن اُس کا دوسرا حصہ یعنی اُن اپنوں کے نام جو مجھے پاگل سمجھتے ہیں، سے کیا تعلق ہے؟ اُس کی وضاحت درکار ہے۔

''ہزاروں غم'' کے کہانی کار ڈاکٹر مشتاق وانی خود ایک ٹوٹی اور بکھری ہوئی کہانی کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔ زیرِ بحث مجموعے کی کئی کہانیوں میں وہ خود آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کی اکثر کہانیوں کا رشتہ اِسی دھرتی اور اِس کے باشندوں کے ساتھ بلاواسطہ ہے۔ اگر وہ اسی طرح سے لکھتے رہے اور اپنی کہانیوں میں مقامی رنگ برقرار رکھ سکے تو بہت جلد اپنا ایک انفرادی مقام بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

# کانچ کی سلاخ

زنفر کھوکھر

1990ء کے بعد جن خواتین قلم کاروں نے اپنی گونا گوں تخلیقات سے علمی وادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اُن میں زنفر کھوکھر کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ زنفر ایک افسانہ نگار ہیں جو ریاست کے ایک دُور افتادہ اور پچھڑے ہوئے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کا اوّلین افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' 1990ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ان افسانوں میں اُنہوں نے جو پیرائیہ اظہار اختیار کیا ہے، وہ قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ بظاہر یہ سیدھے سادے افسانے ہیں اور ان میں عشق ومحبت کی تب وتاب دیکھنے کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی مسائل کچھ اس طرح اُبھارے گئے ہیں کہ اُن کا تاثر بڑی دیر تک دِل ودماغ پر قائم رہتا ہے۔ اگرچہ ''خوابوں کے اُس پار'' زنفر کھوکھر کی افسانہ نگاری کا اوّلین پڑاؤ ہے لیکن وہ اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے اپنے دِل کی بات لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اور یہ سب سے بڑی بات ہے۔

پروفیسر ظہور الدین، زیرِ بحث افسانوی مجموعے کے دیباچے میں زنفر کے فن کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ ا[illegible] زنفر کھوکھر کی تحریر میں وہ مقناطیسیت تو پیدا

نہیں ہوئی جس کے بغیر فن کار کو حیاتِ دوام حاصل نہیں ہوتی
لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ اس مقناطیسیت تک پہنچنے کیلئے جس
بنیادی جوہر کی ہر فن کار کو ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی تخیل کی بے
پایانی اور فکر کی جولانی، یہ دونوں عناصر زنفر کے قلم نے کما حقہ عطا
کیے ہیں۔''

''کانچ کی سلاخ'' زنفر کھوکھر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، ان افسانوں میں وہ ایک نئے زاویے سے سامنے آئی ہیں۔ ان افسانوں میں تخیل کی تازہ کاری کے ساتھ فکر وفن کے نئے دروازے بھی وا ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں زنفر کی محنت اور بے پناہ صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ ''کانچ کی سلاخ'' 26 افسانوں پر مشتمل ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ ان افسانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) سنجیدہ افسانے

(۲) مزاحیہ افسانے

''خوابوں کے اُس پار'' سے لے کر ''کانچ کی سلاخ'' تک زنفر کھوکھر نے جو سفر طے کیا ہے، وہ زیادہ طویل نہیں ہے، یہی تین چار سال پر محیط ہے۔ اس سفر کے دوران اُنہوں نے بے شمار افسانہ نگاروں کے فن پاروں کا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدے کو بھی جاری رکھا۔ اسی مطالعے اور مشاہدے کے راستے سے وہ فن کے دشوار گذار منزلوں کو سر کرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئیں جہاں سماج کے کھوکھلے نظام کی جھلک صاف طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ اسی لیے اُن کے افسانوں میں لوگوں کے سماجی، اقتصادی، مذہبی اور معاشی مسائل کی جھلکیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بعض افسانوں میں اُن کا اصلاحی رجحان بھی بڑے شد و مد کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ وہ سماج کی اصلاح کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی اصلاح بھی کرنا چاہتی ہے۔ اسی لیے اُن کے ہاں کہیں کہیں مسلمان گھرانوں کے مسائل کی تصویریں بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ امین بنجارہ ''کانچ کی سلاخ'' کے سرنامے میں زنفر کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زنفر کھوکھر کا شمار بھی اسی نوع کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے

جنہوں نے نہ صرف عصرِ حاضر کے نشیب و فراز کا کامیاب منظر
نامہ پیش کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے بلکہ فرسودہ رسم و رواج، گھٹن،
محرومیوں اور مجبوریوں کے خلاف کمر بستہ ہونے اور معاشرتی
پھندوں کو توڑ کر انسانی روح کی آزادی کو اپنا ایمان بنا رکھا
ہے۔ زنفر کھوکھر اس بات کی قائل نہیں ہیں کہ انسان رنج و غم کے
حصار میں مقید ہو کر رہ جائے یا پھر کسی بھی مسئلے کو اپنی جان کا روگ
بنا لے۔ وہ پل پل ٹوٹنے اور بکھرنے کے بجائے خوشحال،
پُرسکون اور آزاد فضاؤں میں سانس لینے کو ترجیح دینے کا پیغام
دیتی ہے۔''

''کانچ کی سلاخ'' کے افسانوں میں زیادہ پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ زنفر کا فن برق رفتاری سے ترقی کے مختلف زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے، جو خوش آئند قدم ہے۔ زنفر کا خلوص اور اُن کی محنت اور صلاحیت ان افسانوں میں جگہ جگہ عیاں ہے۔ اُنہوں نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے اپنے فن کے چُھپے ہوئے گوشوں کو بھی اُبھارنے کی کوشش کی ہے اور سچائی اور حقیقت پسندی سے کبھی بھی گریز نہیں کیا۔ اس طرح سے اُن کی کہانی مختلف دشوار گذار منزلوں سے گذرتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی لیے پلاٹ میں تازگی، کرداروں میں حرکت، واقعات میں تسلسل اور مکالموں میں برجستگی اُن کے افسانوں کا خاص جوہر ہے۔

زنفر کے افسانوں میں آج کل کے انسان کا درد و کرب جس طرح سے سمٹ کے آیا ہے، وہ قابلِ ذکر ہے۔ دُنیا میں پھیلی ہوئی بد دیانتی، تضاد، ٹکراؤ اور ذہنی افراتفری نے ایک انسان کے ذہن میں سوالات کا طوفان پیدا کیا ہے۔ ایک حقیقی فن کار اس کو محسوس کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ چوں کہ زنفر ایک حساس افسانہ نگار ہیں، اُنہوں نے دُنیا میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور پھر اپنے مطالعے اور مشاہدے کی بھٹی میں تپا کر ایک حقیقی تصویر قارئین کے سامنے پیش کی ہے۔ اُن کی نگاہ تیز اور ذہن بیدار ہے، اُن کا دِل ملائم اور جذبہ

جوان ہے، اسی لیے اُن کے افسانوں میں بعض چھوٹے چھوٹے مسائل بھی توجہ طلب معلوم ہوتے ہیں۔ یادیں، حکم نامہ، مجبوری، سمجھوتہ اور انجام زنفر کھوکھر کے ایسے افسانے ہیں جن میں بعض ایسے مسائل اُبھارے گئے ہیں جنھوں نے آج کل کے انسان کو ایک ایسے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے جہاں سراب ہی سراب ہے۔ لیکن یہ زنفر کا کمال ہے کہ اُنہوں نے اپنے قلم کی جولانی سے سماجی بدعتوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

زنفر کھوکھر نے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں اور سماجی اور اصلاحی افسانے بھی، اپنے رومانی افسانوں میں وہ نوجوانوں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ صبر و تحمل اور جذبۂ ایثار سے کام لینے کی تلقین بھی کرتی ہیں۔ زنفر کے ان افسانوں میں بھی اصلاحی رجحان نظر آتا ہے۔ وہ ہمارے اُس سماج میں سُدھار لانے کی کوشش کرتی ہیں جس نے ہمارے تمام نظام کو پراگندہ بنا دیا ہے۔ اُن کے مطابق غربت، افلاس اور تنگ دستی ہی ہمارے سماج میں بگڑے ہوئے نظام کی جڑ ہے اور یہ جڑ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر پیوست ہو جاتی ہے۔ اُن کے افسانوں خواب، کانچ کی سلاخیں، خاموشی، مجبوری اور انجام کچھ اسی طرح کے افسانے ہیں جن میں زنفر نے سماجی نظام کی کھوکھلی اور بے بنیاد دیواروں کو گرا کر رکھ دیا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، زنفر کھوکھر کے افسانوں میں احساس کی گرمی اور جذبات کی تہہ داری کا احساس دلاتے ہوئے ''کانچ کی سلاخ'' پر رائے زنی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''زنفر کھوکھر کے افسانوں میں محسوسات اور احساسات کے کئی پرتو دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ وہ زندگی کے ہر ایک پہلو پر گہری نگاہ رکھے ہوئے ہیں اور زندگی سے وابستہ گوناگوں مسائل پر غور و فکر کرتا ہوا ذہن اُن کے پاس موجود ہے، کسی ادیب یا شاعر کے ہاں اگر حسیت اور عصری آگہی کے اوصاف موجود ہوں تو یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جو فن وہ تخلیق کرے گا اُس فن میں ایک معاشرہ سانس لیتا نظر آئے گا اور یہ خوبیاں زنفر کے ہاں کافی حد تک موجود ہیں۔''

زنفر کی کہانیاں حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا مصنوعی پن نہیں بلکہ اُنہوں نے آج کل کی گھریلو زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی بھی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے اور شوہر اور بیوی، ساس اور بہو کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا بھی بخوبی جائزہ لیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے اِرد گرد کے ماحول کو خوب جانچا اور پرکھا ہے۔ اسی لیے وہ زندگی کے ان نازک معاملوں پر بھی بڑی بے خوفی کے ساتھ قلم چلاتی ہیں۔ سماج کی گھٹن نے زنفر کی زندگی کا ہر پل ناقابلِ برداشت بنایا ہے۔ وہ آہوں اور سسکیوں کی زندگی کا قلع قمع کرنا چاہتی ہیں اور آزاد فضاؤں میں سانس لینا چاہتی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں اس طرح کی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں جن سے ہمارے سماج کے کھوکھلے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور ایک نئی صبح کا تصور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

زنفر کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں بلکہ وہ براہِ راست اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی قائل ہیں۔ اُن کی زبان میں فارسیت کا غلبہ نہیں۔ اُنہوں نے آسان اور خوشنما الفاظ اور تراکیب کا سہارا لے کر اپنے افسانوں میں رنگ آمیزی کی ہے۔ اسی لیے اُن کے افسانے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اگر وہ اسی طرح لکھتی رہے اور کہانی میں پلاٹ سازی اور کردار نگاری کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرتی رہے تو عنقریب ہی افسانہ نگاری کے اُفق پر ایک اور نام کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ بہر حال ''کانچ کی سلاخ'' ایک باصلاحیت خاتون افسانہ نگار کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ اپنا یہ مکالمہ ختم کرنے سے قبل پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے وہ الفاظ دوہرانا چاہتا ہوں جن سے زنفر کی افسانہ نگاری کی صحیح، مکمل اور جامع تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

> ''اُردو افسانہ نگاری میں اگرچہ زنفر کھوکھر کی آواز ابھی نئی ہے
> لیکن اس آواز میں جو درد، جو تاثیر اور جو آہنگ موجود ہے وہ یہ
> بتا رہا ہے کہ زنفر اپنے افسانوں کی وساطت سے عنقریب ہی
> ریاستی ادب میں ایک خاص مقام حاصل کرنے والی ہے۔''

# تپسوی کون؟

آنند لہر

ریاست جموں وکشمیر کے نئے لکھنے والوں کی فہرست میں آنند لہر کا نام قابلِ توجہ ہے۔ اگر چہ وہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے اُبھرے، لیکن اُن کی آواز اُس وقت غور سے سُنی گئی جب ۱۹۸۴ء میں ''انحراف'' کے نام سے اُن کی کہانیوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آ گیا۔ ان کہانیوں میں بقول کمار پاشی موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں اُن کے ڈراموں کا مجموعہ ''نروان'' شائع ہوا۔ یہ ڈرامے بھی اُن کی کہانیوں کی طرح دل چسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

''تپسوی کون؟'' آنند لہر کا تازہ ترین ڈراما ہے جو اُنھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اناسی ۷۹ صفحات پر مشتمل یہ ڈراما تیرہ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک حصّہ نئی صورتِ حال لے کر سامنے آتا ہے لیکن کرداروں کے تال میل اور پلاٹ کی گرفت نے ڈرامے میں تسلسل برقرار رکھا ہے۔ کہانی ایک ایسے گھر سے شروع ہوتی ہے، جہاں ایک طرف ایمانداری کا ڈنکا بج رہا ہے اور دوسری طرف بے ایمانی اور رشوت خوری کا بازار گرم ہے۔ یہ تفاد اور ٹکراؤ کی کہانی ہے جس کو آنند لہر نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈرامے کے اوّل سے آخر تک کشمکش پائی جاتی ہے لیکن جس طرح ہمیشہ صداقت اور سچائی کی جیت ہوتی ہے اور جھوٹے اور

فریبی بے نقاب ہو کر قدم قدم پر رسوا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آنند لہر کے اس ڈرامے میں سچ اور اہنسا کی جیت ہوتی ہے۔ شنکر جیسا ایماندار باپ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ اُبھرتا ہے لیکن اِس کے برعکس اُس کا بیٹا شِو بے ایمانی اور دغابازی کو اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ اِس طرح سے تصادم اور ٹکراؤ اِس ڈرامے کے ہر موڑ پر نظر آتا ہے۔

آنند لہر جدیدیت سے متاثر ہیں لیکن وہ روایت کی پاسداری بھی رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے سماج کے بہت ہی حساس اور نازک پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے۔ ''تپسوی کون؟'' میں بھی اِس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ڈرامے میں چھوت چھات کا مسئلہ بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ سدھیر، مِس نلنی سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے لیکن اونچ نیچ کا سوال درمیان میں حائل ہے۔ شنکر ایماندار ہے لیکن پرانے اور فرسودہ خیالات کا حامی۔ اِس لیے وہ اپنے بیٹے سدھیر کی اس خواہش کی زبردست مخالفت کرتا ہے کہ وہ مِس نلنی جیسی غیر برادری سے تعلق رکھنے والی لڑکی سے شادی کرے۔

ڈرامے میں شِو، شنکر، سریش، سریتا، نِرملا، رمن، سدھیر، رمیش، نرائن، مِس ورما، شاما، اروڑہ، گوپی چند، گوپال، انوج اور اُن کے علاوہ بیسیوں کردار جابجا نظر آتے ہیں۔ اناسی صفحات پر مشتمل اس مختصر سے ڈرامے میں کرداروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ڈرامے کی فضا کو مدہم بنا دیتا ہے۔ پڑھنے والا کرداروں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ بعض غیر ضروری کردار بھی سامنے آجاتے ہیں جن کو آسانی سے خارج کیا جا سکتا تھا۔

آنند لہر مکالمہ نویسی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ اپنے مکالموں کے ذریعے سے کرداروں کو حرکت و حرارت بخشتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں زبان کی گراں باری محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ انوکھے انداز میں اپنی بات دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اُن کا لہجہ نرم اور ملائم ہے جو ڈرامے کی کامیابی کا ضامن ہے۔ اس ڈرامے کو ادارۂ فکرِ جدید نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ڈسٹ کور نہایت ہی معنی خیز ہے اور قیمت مناسب ہے۔

# نیا آہنگ

## اختر الایمان

اختر الایمان نے اپنے معاصرین شعراء پر قابلِ قدر اثر چھوڑا ہے۔ ان سے پہلے میرا جی اور ن.م. راشد نے اپنے فنی رکھ رکھاؤ اور اسلوبِ بیان کی تازگی سے جدید نظم کی ارتقائی منزلوں کو چار چاند لگا دیے لیکن اختر الایمان نے ان سے ایک قدم آگے جا کر اپنے شعور کی بالیدگی اور ذہن کی پختگی سے اُردو کی جدید شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور ہیئت و اسلوب کے لحاظ سے بالکل نئے تجربے کیے اور شعوری طور پر نظم کے تعمیرِ حسن کو فراوانی بخشی۔ اِس بات کا انکشاف اُس وقت ہوا جب نبت لمحات کے نام سے اُن کا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آ گیا۔ اس مجموعۂ کلام سے پہلے گرداب' تاریک سیاہ' آب جو' یادیں وغیرہ شائع ہو کر ادبی دنیا میں بحث کا موضوع بن چکے تھے۔ ''نیا آہنگ'' اُن کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے۔

اختر الایمان کا وطن یو. پی ہے۔ یہیں اُن کا بچپن گزرا۔ دِلی کالج اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تعلیم پائی جہاں سے ترقی پسند شعراء کی ایک نمائندہ نسل سامنے آئی۔ مجازؔ، جاں نثار اختر، جذبیؔ، سردارؔ جعفری اور منیبؔ الرحمٰن وغیرہ اسی دور میں شہرت کے آسمانوں کو چھونے لگے۔ اختر الایمان بھی انھیں لوگوں میں نمایاں طور پر نمودار ہوئے۔ اُن کے ایک طرف یو پی کا نوابانہ ماحول تھا اور دوسری طرف دلی اور علی گڑھ جیسے بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی، ایک طرف مشینی

دور کی تو بہ شکن آوازیں اور دوسری طرف نچلے طبقے کے لوگوں کی ناگفتہ بہ زندگی اور پھر ملک کے بٹوارے کا المیہ، اس ماحول نے اختر الایمان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر گھرے نقوش چھوڑے اور یہی دکھ درد، غربت، افلاس، سماجی پسماندگی، ہندوستانی معاشرت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا غم وہ اپنی شاعری میں انڈیلتے رہے۔ 'نیا آہنگ' ایک بار پھر اسی کی روداد پیش کر رہی ہے جس کا اعتراف خود بھی اختر الایمان مجموعہ کے پیش لفظ میں یوں کرتے ہیں:

''میری شاعری کیا ہے؟ اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا۔ یہ کرب مختلف اوقات میں مختلف محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے۔''

''نیا آہنگ'' میں شامل نظمیں اختر الایمان کے نئے تجربات، احساسات اور محسوسات سے بھرپور ہیں۔ اس میں سے چند نظمیں بہت پرانی ہیں اور مختلف اوقات پر مختلف جرائد میں چھپ چکی ہیں۔ 'امید' اور 'بیٹے نے کہا' یہ نظمیں رنگ و آہنگ اور موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے کافی عرصہ پہلے کی معلوم ہوتی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان دو نظموں کا حسن، رنگ اور دلکشی ماند پڑ گئی ہے بلکہ یہ نظمیں بھی اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہیں۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

☆ تارے ماند پڑتے ہیں
شب کے تیرہ آنگن میں
چاند مسکراتا ہے
نور کا فرستادا
برف کی طرح ٹھنڈا
دیکھ کر یہ منظر میں
سوچتا ہی رہتا ہوں
اپنے جی میں کہتا ہوں

میری صبحِ فردا بھی شائد ایسی روشن ہے (اُمید)

☆ بیٹے نے باپ سے پوچھا عجب انداز کے ساتھ
پھر یہ کیوں ہے کہ اندھیرا ہے ہمارے گھر میں
اور اس گھر میں ابھی تک بھی دیا جلتا ہے!......(بیٹے نے کہا)

''نیا آہنگ'' کی بیشتر نظمیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔ اختر الایمان نے علامتوں کا استعمال کر کے جدید نظم نگاری کو ایک اہم موڑ دیا ہے۔ یہ علامتیں اکثر پیکروں کی شکل اختیار کر کے انسان کو دُور فضاؤں میں لے جاتی ہیں اور کبھی زبان و بیان کی کھردراہٹ میں مقید ہو کر قاری کو بار بار جھنجھوڑنے کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ پیچیدہ تجربات اور احساسات کو بیانیہ انداز میں پیش کرنے کے روا نہیں بلکہ علامتی اسلوب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ تمام شعری لوازمات کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ علامتوں کا بے جا استعمال ، زبان و بیان کا انفرادی رنگ، فنکارانہ چابکدستی، تشبیہات و استعارات کا انوکھا استعمال اور اسلوب کا نرالا انداز ان تمام خصوصیات کا جائزہ ''نیا آہنگ'' پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے اُن کی نظموں میں نئے پیکر وجود میں آتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اختر نے نئے نئے موضوعات کا انتخاب کر کے اپنی نظموں کو نئی تکنیک سے بالکل نیا اور جدید آہنگ بخش دیا ہے۔ زبان و بیان سادہ، انوکھا اسلوب اور طرزِ تحریر دلکش ہے۔ مثلاً:

؎ میرا پڑوسی بڑا پیارا آدمی تھا، اسے
گلی میں آن کے آواز دی ''غلام رسول!''

معاً مجھے یاد آیا میرا پیارا ہمسایہ
کبھی کا بن چکا بیچارہ اڑتے وقت کی دھول (پکنک)

؎ شہر سب ایک سے ہوتے ہیں کہیں
قحبہ خانے ہیں بہت اور کہیں رہنما
ڈھیر آلے سے ہیا لوگ جرائم پیشہ

مختصر یہ ہے کہ بے چاری یہ اللہ کی زمین
اپنی گردش کے علاوہ بھی ہے مجبور بہت (قدرِ مشترک)

''نیا آہنگ'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اُن کی نظموں میں کائنات کے مسائل، سماجی نابرابری، معاشی بدحالی اور انسانی زندگی کا درد و کرب ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اختر کی نظموں میں احساس اور فکر کی ہم آہنگی براہِ راست پائی جاتی ہے۔ وہ انسان کا درد محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زمین سے تا فلک تمام ذرّے ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک انسان کو فقط دو وقت کی روٹی، سر چھپانے کو چھپر اور ایک عورت کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر باہر کی فضاؤں میں بھی سانس لینا ہے۔ وہ زمانہ بیت چکا ہے جب ایک انسان ذہنی، سماجی اور تعلیمی لحاظ سے بہت پست تھا۔ اس کو چاہئے کہ وہ چار دیواری کے قیود سے نکل کر وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ کر مقابلہ کرے۔ اپنی نظم ''آثارِ قدیمہ'' میں انھوں نے اسی تاثر کا اظہار کیا۔ ملاحظہ کیجئے۔

؎ برتن، سکے، مہریں، بے نام خداؤں کے بُت ٹوٹے پھوٹے
مٹی کے ڈھیروں میں پوشیدہ چکی چولھے
کند اوزار زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی
کچھ ہتھیار جنھیں استعمال کیا کرتے ہوں گے مہلک حیوانوں پر
کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے میرا
انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے کیا مر جاتا ہے؟

''راہِ فرار'' اختر الایمان کی اہم نظم ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے وطنِ عزیز کی تاریخ کے مختلف ادوار کا محاکمہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بدنصیب ملک تاریخ کے مختلف ادوار میں کس طرح ظالموں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوا۔ یہ ملک بار بار لٹا اور بار بار اس کی آبرو تار تار ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہو یا نادر شاہ کا قتلِ عام، انگریزی سامراج کی شاطرانہ چالیں ہوں یا ہندوستان کا بٹوارہ، یہ سب باتیں ہماری میراث بن چکی ہیں۔ اختر اس میراث کو اپنانے سے عار نہیں کرتے کیوں کہ یہ اس کے جسم و جان کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ ''راہِ فرار'' میں اختر

الایمان نے حال اور مستقبل کے ایسے ہی مسائل کی چاپ سُن لی ہے۔ وہ ایسی نسل کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی سکت نہیں۔ وہ ان تلخ واقعات اور مسائل کی تکرار کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے سمِ قاتل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی آگہی ضروری ہے۔ اختر کی یہ نظم علامتی ہے۔ وہ دراصل ایک منفی انداز اختیار کر کے ان واقعات کی تلخیاں واضح کرتے ہیں۔ ''راہِ فرار'' اختیار کر کے اختر الایمان دراصل ان زخموں کے ٹانکوں کو کھول دیتے ہیں جوان کے دل پر لگے ہیں اور وہ زخموں کے یہ پھول اپنی نسل کو پیش کرتے ہیں تاکہ ان میں بھی آگہی اور ادراک کا شعور پیدا ہو اور وہ ایک بہتر زندگی کی راہ تلاش کریں۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

ادھر سے نہ جاؤ
کوئی راہ میں روک لے گا
نیا کوئی خطرہ نیا مسئلہ کوئی جس کا
نہ سوچا نہ سمجھا نہ احساس ہے جس کا اب تک
کوئی ایسی صورت نکالو
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی اور راہِ فرار ایسی ڈھونڈو
کہ ہم زندگی کے جہنم کو جنت سمجھ لیں!

اختر الایمان کے کلام میں خود کلامی کا رُجحان بہ درجہ اُتم پایا جاتا ہے۔ اکثر جگہوں پر وہ خود سے ہم کلام ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں خیالات، احساسات اور جذبات کو محسوس کرنے کا جوانوکھا انداز ملتا ہے۔ یہ اُن کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وہ ہنگاموں، جنگ و جدل اور خون ریزی سے کسی شخص، چیز یا معاملے پر قابو پانے کے عادی نہیں بلکہ محبت، خلوص اور شفقت سے حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ مثلاً:

اٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دُعا بلند کریں
خدا کا شکر بجالائیں آج کے دن بھی

نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا

زبان سے کلمۂ حق راست کچھ کہا جاتا

ضمیر جاگتا اور اپنا امتحان ہوتا (شیشے کا آدمی)

گر ہم پلٹ کے یہاں آئے اور اس

صحرا کی زندہ ریت نے بستی کو کھا لیا

سب اپنے جھنڈے ہر جگہ لہراتے پائیں گے

ہم ان کے نیچے پرکھوں کی قبریں بنائیں گے (مداوا)

اختر الایمان نے مختصر نظموں کو فروغ دینے میں جو سرگرم حصہ لیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ''نیا آہنگ'' ایسی ہی نظموں کا مُرقع ہے۔ قدرِ مشترک، تادیب، نیا آہنگ، گریز، ایک کیفیت، لطیفہ وغیرہ قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ اِن نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے سمندر کو کوزے میں بند رکھنے کی ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ اس کے اثرات آج کل کے بیشتر لکھنے والوں میں نظر آتی ہے۔ خورشید السلام، شہریار، محمد علوی، عادل منصوری وغیرہ کے ہاں اختر الایمان کی مختصر نظموں کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

''سب رنگ'' کے عنوان سے ''نیا آہنگ'' میں اختر کی ایک اہم نظم ملتی ہے۔ یہ ایک منظوم ڈراما ہے جس میں مختلف کردار، منظر کشی، وقت کا خیال، حاضرین، زمان و مکان کا تصور اور مکالمے بھی ہیں لیکن ڈرامے کے کردار حیوانات مقرر کے گئے ہیں جنھوں نے اپنا اپنا رول بڑی خوبی اور دیانتداری سے نبھایا ہے۔ نظم ''سب رنگ'' علامتوں سے مالامال ہے اور طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ اختر نے علامتوں کے ذریعے سے اپنی نظموں میں انگریزوں کے سفاکانہ اور ظالمانہ پن کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۷ء کا المیہ اختر کے لیے نا فراموش واقعہ ہے اور اس المیے کا گھاؤ سالہا سال گزرنے پر بھی ان کے دل میں تازہ ہے۔ یہ نظم ۱۹۴۳ء کی ہے اور ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ نظم کے ابتدائیہ میں اختر الایمان نے اپنے اسی ڈرامے سے قارئین کا تعارف کرایا ہے۔ انھوں نے اس منظوم ڈرامے کا مقام براعظم ایشیا کا ایک جنگل مقرر کیا ہے۔ تماشائی، شجر و حجر، وقت، اندھیرے اُجالے کے درمیان اور زمانہ ہمارا آپ کا رکھا ہے۔

''سب رنگ'' کا تعارف بہ ذاتِ خود چند علامتیں پیش کرتا ہے۔ اس نظم کو اختر الایمان نے کئی رنگوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے رنگ کا تعارف وہ یوں کراتے ہیں:

''ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ ایک ہی قوم و جماعت تھے۔'' (کتاب الحکمت)

دوسرے رنگ کا تعارف یوں ہو رہا ہے:

''اچھے شوہروں کی رائے ہے کہ حُسن عموماً بنجر زمین کی مانند ہوتا ہے۔ نہایت شاداب زمینوں میں کچھ بڑے ٹکڑے بھی نکل آتے ہیں۔'' (جان ڈف)

اس منظوم ڈرامے کا تیسرا رنگ یوں بیان کرتے ہیں:

''اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ گو ایمان کا دعوےٰ کرتے ہیں مگر فی الحقیقت مبتلائے شریک ہیں۔'' (کتاب الحکمت)

آخر میں چوتھے رنگ کا تعارف یوں کراتے ہیں:

''مجھے کتوں نے گھیر لیا ہے۔ شیطنیت نے احاطہ کر لیا ہے۔ میرے ہاتھ اور پاؤں گھائل ہو گئے ہیں۔ میرے رفیق مجھے ان کتوں سے رہائی دِلوا۔'' (انجیل مقدس)

''نیا آہنگ'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان عصرِ حاضر کے مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کی شاعری پرانے اور دقیق خیالات کی ترجمان نہیں بلکہ ان کی شاعری میں زندگی کے نئے تجربات اور مشینی دور کی بیش بہا ترقی کا احساس ہوتا ہے۔ اختر الایمان کے زیرِ بحث مجموعہ میں عجیب کیفیت، گداختگی، تڑپ اور گھلاوٹ ملتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ درد و غم، احساسِ شدت، اظہار کی بے تکلفی اور ہندوستانی کلچر، تمدن اور تہذیب کا ایک خاص رچاؤ بھی ان کے کلام کا حاصل ہے۔ حق بات تو یہ ہے کہ اختر الایمان عصرِ حاضر کے ایک اہم شاعر ہیں۔

(ماہنامہ سیارہ لاہور جلد ۵۴ شمارہ ۴۳ (اشاعتِ خاص) مئی جون ۱۹۸۸ء)

# رشکِ قمر

## قمر جلال آبادی

قمر جلال آبادی فلمی دنیا کے ایک مشہور و معروف شاعر اور نغمہ نگار ہیں۔ ان کے گیتوں میں جہاں ایک طرف سوز و گداز اور کیف و سرمستی ہے وہاں دوسری طرف درد و کسک کی ہلکی ہلکی آنچ بھی ملتی ہے۔ قمرؔ کی آواز دُور سے پہچانی جاتی ہے اور اس کا زیر و بم بڑی دیر تک کانوں میں گونجتا ہے۔ قمرؔ کے گیتوں اور نغموں سے رس اور لوچ ٹپکتا ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے جذبات اظہار کرنے پر قادر ہیں۔ مشہور شاعر قتیلؔ شفائی ایک جگہ پر قمرؔ جلال آبادی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قمر ایک فرد نہیں بلکہ ایک اِنسٹی ٹیوشن ہیں۔ آپ نے اپنے اُردو ہفتہ وار 'اِسٹار' لاہور میں میری، رضا ہمدانیؔ، فارغ بخاریؔ، ابن انشاؔ اور افسانہ نگار رام لال کی اوّلین تخلیقات شائع کر کے ہمیں ادبی دُنیا سے متعارف کرایا۔''[1]

''رشکِ قمر'' قمر جلال آبادی کا اوّلین شعری مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی ۶۷ غزلیں شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ جناب کالی داس گپتا رضاؔ نے لکھا ہے اور کسی نامعلوم شخص نے

---

[1] فلمی دُنیا کے ساتھ وابستہ ہو نے سے قبل قمرؔ صاحب ہفتہ وار اسٹار لاہور کے ساتھ وابستہ تھے۔

قمر جلال آبادی، مختصر سوانح حیات کے عنوان سے قمر صاحب کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد غزلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ قمر کی غزلوں میں جہاں ایک طرف روایت کی پاسداری ملتی ہے وہاں دوسری طرف جدیدیت کی رنگ آمیزی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ ایسی جدیدیت کے خلاف ہیں جو بے معنی ہے۔ قمر جلال آبادی نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور قطعات اور رباعیات بھی لیکن ان کی غزلیں اُن کی جودتِ طبع کی غماز ہیں۔ قمرؔ، علامہ اقبالؔ، مولانا ظفر علی خاں اور تاجور نجیب آبادی سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کی غزلوں میں جوشؔ، جگرؔ، احسان دانش اور حفیظؔ جالندھری کا رنگ بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ لیکن اس رنگ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا ایک الگ اور انفرادی رنگ بھی ہے۔ قمر کی شاعری میں تغزل، نغمگی اور مٹھاس کی کمی نہیں۔ یہ نغمگی اور موسیقیت اُن کی غزلوں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں درد بھی ہے اور کسک بھی، نغمگی بھی ہے اور سرور و کیف بھی، مثلاً:

ساری دنیا میں اُسے ڈھونڈھ کے گھر لوٹے ہیں
اور آنگن ہی میں وہ جلوہ کناں ہے یارو

ہم نے پالا ہے اسے خونِ جگر کا دے کر
ہم سے پوچھا کرو تم زخمِ جگر کی باتیں

عشق کیا ہے مجھے کیا علم، یہی سمجھا ہوں
اِک افسانہ ہے جو آنکھوں سے بیاں ہوتا ہے

آسماں پہ مہہ نو کا یہ چمکنا یوں ہے
یا کسی شوخ کی ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے

دیکھ مت سوئے فلک اونچے مکانوں کی طرح
سج کے بیٹھے ہیں تیری راہ میں دکانوں کی طرح

قمر کی غزلوں کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے ہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ابتدا سے ہی عشق کے معاملے میں ٹھیس کھائی ہے اور زندگی کے بہترین لمحات عشق کے خارزار میں گزارے ہیں۔ اسی لیے اُن کی غزلوں میں محبوب کی بے اعتنائی ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ خاص طور پر ''رشکِ قمر'' کی غزلوں میں وہ جذبۂ عشق سے متعلق اپنے خیالات واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ وہ کبھی حضرتِ یوسفؑ کی طرح مصر کے بازاروں میں بِک جاتے ہیں اور کبھی محبت کے لیے اپنی جھولی پھیلا دیتے ہیں۔ کبھی وہ محبوب کا تعاقب کرتے کرتے صحراؤں کی خاک چھانتے ہیں اور کبھی اپنی جان کی بازی لگا کر بھی وہ محبوب کو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔ مثلاً:

یوسف جیسے بِک جاتے ہیں ہم جیسوں کی گنتی کیا
پوچھیں گے بازار میں ہم بھی جنس ہنر کے بارے میں

چھولی پھیلا چکے محبت کی
کوئی داتا نظر نہیں آتا

تب میرے دل کے حال کو تم جان پاؤ گے
اے کاش تم کو بھی ہو محبت کسی کے ساتھ

عشق میں تو جو لُٹ گیا حسن سے تجھ کو ہے گلہ
عشق کہاں گلہ کہاں ذکر یہ دم بدم نہ کر

نگہہ نگہہ سے ملی دِل سے دِل ملا نہ سکا
میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ تجھ کو پا نہ سکا

''رشکِ قمر'' میں مختصر ترین بحور میں بھی چند غزلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ یہ غزلیں بھی اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ خوب صورت تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ نئی اور تازہ علائم دیکھنے میں آتی ہیں۔ اکثر جگہوں پر خیالات اور تجربات نئے سانچوں میں

ڈھلے ہوئے ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں سلاست اور روانی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی، برجستگی بھی ہے اور کیف و سرمستی بھی۔ کہتے ہیں:

؎ روتے ساون میں تم سے بچھڑے تھے　　عمر بھر ایک ہی مہینا ہے

؎ آنکھ سے گر پڑے تو عشق ہے وہ　　اور رُک جائے تو وہ نگینا ہے

؎ یہی ہے جہانِ وفا کی کہانی　　تجھے پالیا اور کھودی جوانی

؎ عشق کے راج میں جا نکلے تھے　　ہیرے پتھر سے سستے دیکھے

''رشکِ قمر'' کی غزلوں میں اگرچہ روایتی تراکیب ملتی ہیں جن میں اقبالؔ، جوشؔ، احسانؔ دانش اور حفیظؔ کی استعمال شدہ تراکیب کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ مثلاً شامِ فرقت، درِ آرزو، حصولِ کائنات، آبِ بقا، کشتِ دل، رشکِ قمر، نگہہ ناز، عاشقِ صادق، روزِ قیامت، ترکِ محبت، رہِ وفا، منزلِ عشق، انتظارِ سحر وغیرہ۔ لیکن قمر نے اِن تراکیب کو کہیں کہیں نئے انداز میں استعمال کر کے اپنے اشعار میں معنی آفرینی پیدا کر دی ہے۔ قمر کی غزلوں میں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ان الفاظ میں مکتی، دیوتا، یووَن، میگھ، ساگر، روپ، سیج، ساون، ندی، گٹھا، لاج، صرف چند خوب صورت، نرم اور ملائم الفاظ ہیں جن کو انھوں نے اپنی غزلوں میں براہِ راست جگہ دی ہے۔ اس طرح سے ان کی غزلوں میں وقار اور وزن پیدا ہو گیا ہے۔

''رشکِ قمر'' کا گٹ اپ دیدہ زیب اور کاغذ اچھا ہے۔

# الہاماتِ مست

دینا ناتھ چکن مست کاشمیری

''الہاماتِ مست'' دینا ناتھ چکن مست کاشمیری کا دُوسرا شعری مجموعہ ہے جو غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مست کی یہ غزلیں غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں۔ مجموعے میں شامل غزلیں باعنوان ہیں۔ ہر ایک غزل کا عنوان مست نے غزل کے ردیف سے ہی اَخذ کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مست کا مطالعہ وسیع ہے۔ اُنھوں نے غالب، داغ، اقبال، حالی، چکبست کے ساتھ ساتھ جوش، حفیظ، برج موہن دتاتریہ کیفی، آنند نرائن ملا کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا ہے۔ وہ برج موہن دتاتریہ کیفی اور جوش ملسیانی سے اکتسابِ فیض کر چکے ہیں۔ اسی لیے اُن کی غزلوں میں اُن تمام شعراُ کے اثرات جا بجا نظر آتے ہیں۔

مست کی غزلوں میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور فن کی نزاکتیں بھی۔ وہ شاعری کے فن سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اساتذۂ فن کا شروع سے ہی مطالعہ کر چکے تھے۔ اُنھوں نے مشاہدے اور مطالعے کی بھٹی میں اپنے آپ کو تپا کر کندن بنا دیا تھا۔ یہی اُن کے فکر وفن کی پہچان ہے۔ اُن کی غزلوں میں عشق و عاشقی کے جذبات بھی ملتے ہیں اور انسانی زندگی کے تجربات بھی، تصوف بھی اور سماجی مسائل کی کارفرمائی بھی۔ وہ ہر وقت نئے نئے مضامین کی تلاش

میں رہتے ہیں اور اپنی شاعری کو ایک نئی سمت عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مستؔ کی غزلوں کا بنیادی موضوع عشق رہا ہے۔ وہ اس موضوع سے زندگی کی گرہیں کھول دینا چاہتے ہیں اور حقائق دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مستؔ کی غزلوں میں جہاں ایک طرف انسانی زندگی کے حقائق کی ترجمانی ہوتی ہے وہاں وہ روایت سے مُنہ بھی نہیں موڑتے۔ اُن کی شاعری میں روایتی شاعری کا بھرپور اثر ملتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نئے نئے مضامین کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں۔ مستؔ کی غزلوں میں بھی اُن کا محبوب موضوع کشمیر اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں کشمیر کے کلچر، تہذیب اور تمدن کی بات کرتے ہیں۔ اُن کا دِل کشمیر کی عطر بیز فضاؤں، ندی نالوں، دریاؤں اور آبشاروں اور سرسبز و شاداب میدانوں کے لیے مچلنے لگتا ہے۔

مستؔ کی غزلیں فن کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ ان میں اگرچہ روایتی الفاظ، تراکیب اور علایم کی جھلکیاں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نئے الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اس طرح سے وہ جدت کے ساتھ ساتھ روایت کا بھی احترام رکھتے ہیں۔ یہی اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

# پچھلے موسم کا پھول

مظہر امام

مظہر امام کا شمار عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے یوں تو نظم و نثر دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اُن کا اصل میدان شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے غزل اور نظم کے علاوہ شاعری کی دوسری اصناف میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں اور اسلوب کی تازہ کاری سے اس میں نئے رنگ بھر دیے ہیں۔ مظہر امام نے آزاد غزل کے نام سے ایک نیا تجربہ بھی کیا اور اس طرح شعر و ادب میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔

مظہر امام کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''زخمِ تمنا''، ''رشتہ گونگے سفر کا'' اور ''پچھلے موسم کا پھول'' قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی نظموں کا انتخاب ''بند ہوتا ہوا بازار'' ۱۹۹۲ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آ گیا جس میں اُن کی ۵۰ منتخب نظمیں شامل ہیں۔

''پچھلے موسم کا پھول'' مظہر امام کا تیسرا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں اُن کی ۵۴ غزلیں، تین آزاد غزلیں اور ایک حمد شامل ہیں۔ اس شعری مجموعے کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر مظہر امام کو بہار اُردو اکادمی، یو. پی اُردو اکادمی، مغربی بنگال اُردو اکادمی اور جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کے ساتھ ساتھ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے

بھی گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا۔

''پچھلے موسم کا پھول'' میں مظہر امام کی وہ غزلیں شامل ہیں جو مختلف علمی و ادبی رسائل و جرائد میں پہلے ہی ''کشمیر کی غزلیں'' کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ چوں کہ قیامِ کشمیر کے دوران وہ یہاں کے باغوں، جھیلوں، ندی نالوں اور آبشاروں سے مسحور رہوئے تھے، اُنھیں یہاں کے پُر اسرار سناٹوں اور دیودار سے لدے ہوئے گھنے جنگلوں سے دل چسپی ہوگئی تھی۔ اِسی لیے اُن کی شاعری میں کشمیر کی خوبصورتی یہاں وہاں موہوم صورت میں نظر آتی ہے۔ مظہر امام مختلف علامتوں کے ذریعے سے کشمیر کی تصویر اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہیں کہیں اپنے اشعار میں واضح اِشارے بھی کرتے ہیں۔ مثلاً جن علامتوں سے اُنھوں نے کام لے کر اِس وادیٔ رنگ و بو کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے اُن میں چنار، خوشبو، گلاب، برف، موسم، دریا، ہوا، ابر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مظہر امام کی کشمیر کی غزلوں میں کشمیر کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی لیکن بقول پروفیسر حامدی کاشمیری اِن غزلوں میں اگرچہ واضح طور پر کشمیر کی تاریخ یا جغرافیہ نہیں لیکن کشمیر کی خوشبو جابجا ملتی ہے۔

مظہر امام کی غزلوں میں نہ صرف کشمیر کا موسم، کشمیر کے درخت، کشمیر کا حُسن اور اِس کی خوبصورتی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جھلکتی ہے بل کہ زیرِ بحث شعری مجموعے کے اکثر و بیشتر اشعار ایسے ہیں جو شاعر پر گزرے ہوئے اُن واقعات و حادثات کی ترجمانی کرتے ہیں جن سے وہ اپنے قیامِ کشمیر کے دوران دوچار ہوئے ہیں۔ یہ واقعات و حادثات اُن کی بیتی ہوئی زندگی کی یادیں ہیں جو اُن کے لیے ایک قیمتی اثاثے سے کم نہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر اُنھیں کشمیر میں زندگی کے چند بہترین سال گزارنے کے مواقع نہ ملتے تو وہ ان غزلوں میں سے بہتر اشعار کہہ ہی نہیں سکتے۔

''پچھلے موسم کا پھول'' کے چند نمائندہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں اِس وادیٔ رنگ و بو کی عکاسی کی گئی ہے:

کشمیر کی غزلوں پر احسان اسی کا ہے
لفظوں کی قبادی ہے ہونٹوں کو نوادی ہے

یہ ساری برف گرنے دو مجھی پر
تپش تم سے ہوا ہے اور میں ہوں

اب چناروں پر بھی آگ کھلنے لگی
زخم لو دے رہا ہے تیرے شہر میں

یہ پہلی برف ہے آنکھوں میں بھرلو
یہ موسم پھر بھی اُجلا نہ ہوگا

تُجھ کو پانے کے لیے اُس کو بھلانے کے لیے
ارضِ کشمیر کی وادیٔ جناں بھی کم ہے

گر رہے ہیں زرد پتّے پیڑ سے فالج کی طرح
وادیٔ کشمیر ہے بیمار کا بستر ابھی

مظہر امام فِطرت اور اِنسان دونوں سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، لیکن اِنسان کی ذات سے اُنھیں عشق ہے۔ وہ اِنسان کو ہر زاویۂ نگاہ سے ناپنا چاہتے ہیں، اُس کی قوت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اِس کی فِطرت کو جانچنا چاہتے ہیں۔ اِسی لیے اُن کے زیرِ بحث شعری مجموعے میں کشمیر کے حُسن اور اِس کے حیرت زا موسموں کے ساتھ ساتھ اِنسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی بھی ملتی ہے اور اِس پر اُن کے مترنم اور شگفتہ بحور سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں۔ مثلاً

تم ہوا ہو تو بکھیر و مجھے ساحل ساحل
موجِ مے ہو تو بہالو مجھے دریا کی طرح

ٹوٹی ہوئی دیوار کا سایہ تو نہیں ہوں
میں تیرا ہی بھولا ہوا وعدہ تو نہیں ہوں

نہ جانے دل پہ کیا گزری مگر باہر نہیں بدلا
تمہارے بعد بھی اِس شہر کا منظر نہیں بدلا

ہم نے تو دریچوں پہ سجا رکھے ہیں پردے
باہر ہے قیامت کا جو منظر تو ہمیں کیا

''پچھلے موسم کا پھول'' کی شاعری اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ اِس میں جہاں ایک طرف فلسفیانہ بُو باس مِلتی ہے وہاں دوسری طرف فِکر ونظر کی بالیدگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اِس میں بعض غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں خود کلامی کی کیفیت بھی ہے اور ڈرامائیت بھی۔ ان میں رُوح میں آہستہ آہستہ اُترنے والی طنز کی کاٹ بھی ہے اور جذبے کی شدت بھی۔

مظہر امام چوں کہ مختصر بحور کے استعمال میں خاصی مہارت رکھتے ہیں اِس لیے خوبصورت تشبیہات و استعارات کا سہارا بھی لیتے ہیں جن کی بدولت اُن کی غزلوں میں وُسعت پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں بڑی جاندار تراکیب مطالعے میں آتی ہیں۔ اُن کا اسلوب سادہ ہے اِس لیے اُن کے یہاں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے مانوس اور روزمرہ استعمال کے ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن سے اُن کے اشعار میں تازگی اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً

ہم کو ملا تو سایۂ ابرِ سیہ ملا
ورنہ اس آسمان پہ شمس وقمر بھی تھے

سفینہ ڈوب رہا تھا تو کیوں نہ یاد آیا
تری طلب ترے ارماں کو بادباں کرتے

خوشبو میں مقید ہیں ہمارے گل و لالہ
کُھلتا ہے کہیں زخم کا دفتر تو ہمیں کیا

''پچھلے موسم کا پھول'' کے مطالعہ کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی شاعری بہت سارے نشیب و فراز سے گزر کر اب ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں نہ صرف شاعر اپنے فکر و فن کی خصوصیات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں بل کہ اُن کی شاعری کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ''اچھی شاعری یہی تو ہوتی ہے۔''

''پچھلے موسم کا پھول'' کا ڈسٹ کور دیدہ زیب ہے۔ یہ مجموعہ بہار اُردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شایع ہوا ہے۔ پیش لفظ پروفیسر آل احمد سرور نے ''مظہر امام۔ لفظ کے رمز شناس'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ ۱۲۸ صفحات پر مُشتمل اس شعری مجموعے کی قیمت ۔/۵۰ روپے ہے۔

# گُل تہہِ خاک

## فیروز ظفر بدایونی

''گُل تہہِ خاک'' فیروز ظفر بدایونی کا تیسرا اور تازہ مجموعۂ کلام ہے۔ ان کے اب تک دو مجموعے ''شہرِ گل'' (۱۹۷۰ء) اور ''کانٹوں کی خوشبو'' (۱۹۸۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے تازہ مجموعے میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں اور اس کا آغاز اُن کی خود نوشت سوانح سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے درجِ ذیل عنوانات کے تحت اپنی شخصیت اور فن پر بڑے مختصر انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ ذیلی عنوانات ہیں:۔ 'مجھے بتانا ہے'، 'مجھے اعتراف ہے'، 'مجھے یقین ہے'، 'مجھے ڈر لگتا ہے'، 'مجھے نفرت ہے'، 'مجھے شک ہے'، 'مجھے یاد ہے'، 'میں بھولنا چاہتا ہوں'، 'مجھے پسند ہیں'، 'میرا دل چاہتا ہے'، 'میں سوچتا ہوں'، 'میرا پہلا شعر' اور 'میری تصنیفات'، وغیرہ۔ اس کے بعد ''گلہائے عقیدت'' کے عنوان سے ایک نعتِ شریف بھی شامل ہے۔

''گُل تہہِ خاک'' میں ۱۳ نظمیں، ۴۷ غزلیں، قطعات اور بہت سارے متفرق اشعار شامل ہیں۔ فیروز ظفر بدایونی جدید دور کے ایک باصلاحیت شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں جہاں ایک طرف فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف اس میں کیف و سرمستی اور تازگی و توانائی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ فیروز ایک حساس فن کار ہیں۔ انھوں نے

شاعری کی مختلف اصناف میں اپنے دل کا درد انڈیلا ہے۔ جہاں تک ''گُل تہہِ خاک'' کا تعلق ہے۔اس مجموعے میں وہ سب کچھ محسوس کیا جاسکتا ہے جس نے اس دور کے انسان کو اپنے دانتوں تلے دبا کر اپنا شکار بنا کے رکھ دیا ہے۔ اس مجموعے میں چند بہت ہی خوب صورت نظمیں ملتی ہیں جن سے اس درد وکرب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ان نظموں میں ''عورت''، ''آج اور کل''، ''بھوک''، ''روشنی کا قتل''، ''پاگل اور ہم'' وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

نظم ''عورت'' ظفر کی ایک عمدہ کوشش ہے جس میں وہ عورت کو مختلف رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر ایک رنگ علامتی انداز رکھتا ہے۔ اسی طرح سے نظم ''آج اور کل'' میں ڈرامائی کیفیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ظفر کی نظم ''بھوک'' سب سے الگ اور سب سے جُداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں وہ موجودہ دور کے انسان کا درد وکرب پیش کرتے ہیں۔اسی طرح سے ظفر کی ایک اور نظم ''روشنی کا قتل'' آنجہانی اندرا گاندھی کے قتل کا المیہ بیان کرتی ہے۔نظم ''پاگل اور ہم'' بھی ان کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ نظم قومی یکجہتی، امن وآتشی اور حب الوطنی پر دال ہے۔ چنانچہ اس میں وہ کہتے ہیں۔

جن بھی پاگل کوئی آتا ہے نظر
کوئی کہتا نہیں ہندو یا مسلماں اُسے
وہ ہے عیسائی کہ سکھ یہ بھی نہیں ہم کو خبر
اس کو پاگل ہی کہا جاتا ہے

فیروز ظفر بدایونی غزل میں بھی اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔اُنھوں نے اپنی غزلوں میں بھی اس دور کا آشوب پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ظفر غزل کہنے کا ایک الگ انداز رکھتے ہیں۔اُن کی غزلوں میں داخلی کیفیات اور وارداتِ عشق کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔اُن کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہے۔ظفر کی غزلوں میں چند عمدہ اور قابلِ قدر علائم ملتی ہیں۔تراکیب کی جدت اور تشبیہات واستعارات کے انوکھے پن نے بھی ان کی غزلوں میں نئی روح پھونک دی ہے۔اُن کے موضوعات نئے اور جدید ہیں۔اگر چہ کہیں کہیں اُن کی غزلوں میں روایت

کی پاسداری بھی ملتی ہے لیکن مجموعی طور پر ظفرؔ کی غزلیں نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ یہاں بھی غمِ عشق اور غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ جدید دور کے انسان کا درد و کرب اور اس کی بے راہ روی جگہ جگہ پر نمایاں ہوتی ہے۔ چند مثالیں:

سخت پتھریلا، پیچیدہ، گمراہ کن
منزلوں تک یہی راستا جائے گا

.................

آئینہ کو تھی کہاں تابِ جمال
دفعتاً پہلو بدل کر رہ گیا

.................

حرفِ اوّل حُسنِ جاناں، حرفِ آخر عاشقی
ختم دو لفظوں میں ساری داستاں ہو جائیگی

.................

ہے اگر پہلوئے رُسوائی ملاقاتوں کے ساتھ
زخم ہی ایسا کوئی دے دو کہ یاد آتے رہو

.................

سینکڑوں شیشے کے گھر آباد کر آیا مگر
گاؤں کا کچا مکاں ابتک نہیں بھولا ہوں میں

لیکن اس کے برعکس ظفرؔ کے مجموعے میں چند موضوعات ایسے بھی ہیں جن میں نہ روایت کی پاسداری ہے اور نہ جدتِ خیال۔ اگر ان اشعار کو مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو اس کی صورت کچھ اور ہوتی۔ تاہم ''گل تہہِ خاک'' ظفرؔ فیروز بدایونی کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ مجموعہ اتر پردیش اُردو اکادمی کے مالی اِشتراک سے شائع ہوا ہے۔ قیمت مناسب کاغذ اچھا ہے اور دوست کو دیدہ زیب ہے

شاعری کی مختلف اصناف میں اپنے دل کا درد انڈیلا ہے۔ جہاں تک ''گُل تہہِ خاک'' کا تعلق ہے۔ اس مجموعے میں وہ سب کچھ محسوس کیا جا سکتا ہے جس نے اس دور کے انسان کو اپنے دانتوں تلے دبا کر اپنا شکار بنا کے رکھ دیا ہے۔ اس مجموعے میں چند بہت ہی خوب صورت نظمیں ملتی ہیں جن سے اس درد و کرب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان نظموں میں ''عورت''، ''آج اور کل''، ''بھوک''، ''روشنی کا قتل''، ''پاگل اور ہم'' وغیرہ پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم ''عورت'' ظفؔر کی ایک عمدہ کوشش ہے جس میں وہ عورت کو مختلف رنگوں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر ایک رنگ علامتی انداز رکھتا ہے۔ اسی طرح سے نظم ''آج اور کل'' میں ڈرامائی کیفیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ ظفؔر کی نظم ''بھوک'' سب سے الگ اور سب سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں وہ موجودہ دور کے انسان کا درد و کرب پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح سے ظفؔر کی ایک اور نظم ''روشنی کا قتل'' آنجہانی اندرا گاندھی کے قتل کا المیہ بیان کرتی ہے۔ نظم ''پاگل اور ہم'' بھی ان کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ نظم قومی یکجہتی، امن و آتشی اور حب الوطنی پر دال ہے۔ چنانچہ اس میں وہ کہتے ہیں۔

جن بھی پاگل کوئی آتا ہے نظر
کوئی کہتا نہیں ہندو یا مسلماں اُسے
وہ ہے عیسائی کہ سکھ یہ بھی نہیں ہم کو خبر
اس کو پاگل ہی کہا جاتا ہے

فیروز ظفؔر بدایونی غزل میں بھی اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں میں بھی اس دور کا آشوب پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ظفؔر غزل کہنے کا ایک الگ انداز رکھتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں داخلی کیفیات اور وارداتِ عشق کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہے۔ ظفؔر کی غزلوں میں چند عمدہ اور قابلِ قدر علائم ملتی ہیں۔ تراکیب کی جدت اور تشبیہات و استعارات کے انوکھے پن نے بھی ان کی غزلوں میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اُن کے موضوعات نئے اور جدید ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں اُن کی غزلوں میں روایت

کی پاسداری بھی ملتی ہے لیکن مجموعی طور پر ظفؔر کی غزلیں نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ یہاں بھی غمِ عشق اور غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ جدید دور کے انسان کا درد و کرب اور اس کی بے راہ روی جگہ جگہ پر نمایاں ہوتی ہے۔ چند مثالیں:

سخت پتھریلا، پیچیدہ، گمراہ کن
منزلوں تک یہی راستا جائے گا

..................

آئینہ کو تھی کہاں تابِ جمال
دفعتاً پہلو بدل کر رہ گیا

..................

حرفِ اوّل حُسنِ جاناں، حرفِ آخر عاشقی
ختم دو لفظوں میں ساری داستاں ہو جائیگی

..................

ہے اگر پہلوئے رُسوائی ملاقاتوں کے ساتھ
زخم ہی ایسا کوئی دے دو کہ یاد آتے رہو

..................

سینکڑوں شیشے کے گھر آباد کر آیا مگر
گاؤں کا کچا مکاں ابتک نہیں بھولا ہوں میں

لیکن اس کے برعکس ظفؔر کے مجموعے میں چند موضوعات ایسے بھی ہیں جن میں نہ روایت کی پاسداری ہے اور نہ جدتِ خیال۔ اگر ان اشعار کو مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو اس کی صورت کچھ اور ہوتی۔ تاہم ''گُل تہہِ خاک'' ظفؔر فیروز بدایونی کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ مجموعہ اتر پردیش اُردو اکادمی کے مالی اِشتراک سے شائع ہوا ہے۔ قیمت مناسب کا غذ اچھا ہے اور ڈسٹ کور دیدہ زیب ہے۔

# دستِ چنار

## بلبل کاشمیری

بلبلؔ کاشمیری لندن میں مقیم کشمیری نژاد شاعر ہیں۔ ''دست چنار'' اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔اس سے پہلے ''خندۂ گل'' کے نام سے اُن کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے اور اُردو دنیا سے خراج حاصل کر چکا ہے۔ ''دستِ چنار'' میں اُن کی سنجیدہ نظمیں شامل ہیں۔ یہ تمام نظمیں کشمیریات کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

بلبلؔ کاشمیری وادیٔ کشمیر کے ایک خوب صورت دیہات آجر (بانڈی پورہ) میں پیدا ہوئے۔ کشمیر میں تعلیم وتربیت پانے کے بعد وہ کشمیر کے مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں وہ فوج میں بھرتی ہوئے اور مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آرمی سے وابستہ ہوئے اور پاکستان کو ہی اپنا مستقل مستقر بنالیا۔اب گزشتہ تیس سال سے لندن میں مقیم ہیں اور شعروادب کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔[1]

کشمیریات کے موضوع پر یوں تو متعدد شعراء نے بڑی خوب صورت نظمیں کہی ہیں اور اپنے انفرادی اور انوکھے ڈھنگ سے خطۂ ارضی کو خراج ادا کیا ہے لیکن کشمیر کے موضوع پر مسلسل مجموعے کی صورت میں بلبلؔ کاشمیری کی کوشش مستحسن ہے۔ کشمیر کی خوب صورتی اور

---



[1] بلبل کاشمیری گذشتہ سال انتقال کر گئے۔

کشمیری باشندوں کے افلاس و ناداری اور کشمیر کی تہذیب و تمدن کے بارے میں آج سے لگ بھگ چالیس سال قبل حبیب کیفوی (مرحومہ) کا شعری مجموعہ ''آتشِ چنار'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی نظموں میں بھی وطن سے ہجرت کا درد و کرب اور کشمیر سے اُن کی والہانہ عقیدت کا جذبہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

کشمیر کے ایک اور شاعر پنڈت دینا ناتھ مست کاشمیری کا شعری مجموعہ ''فردوسِ خیال'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ شعری مجموعہ بھی کشمیر سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے۔ مست کاشمیری کا دعویٰ ہے کہ کشمیر کے مختلف موضوعات پر جتنی نظمیں انھوں نے کہی ہیں اتنی ریاست یا ریاست سے باہر کے ہی نہیں بل کہ دنیا کی کسی بھی زبان کے شاعر نے اتنی نظمیں نہیں کہی ہیں۔ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے، یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ البتہ ''فردوسِ خیال'' میں کشمیر سے متعلق مختلف النوع موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔

بلبل کاشمیری کی نظموں کا مجموعہ ''دستِ چنار'' دیکھ کر مسرت ہو رہی ہے کہ انھوں نے طنز و مزاح کے علاوہ سنجیدہ شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے دل میں اپنے مادرِ وطن کشمیر کے لیے درد اور تڑپ ہے۔ معروف شاعر سیّد ضمیر جعفری ''دستِ چنار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کشمیر کے موضوع پر ہمارے اہلِ قلم نے بہت کچھ لکھا ہے...... شعری حوالے سے کئی اعلیٰ درجے کی تخلیقات بھی اس خرمنِ ادب میں یقیناً موجود ہیں مگر مجموعی طور پر جس اخلاص، جس تاثر، جس روانی اور توانائی کے ساتھ وادیٔ کشمیر کا درد بلبل کے لفظوں میں دھڑکتا سنائی دیتا ہے۔ مٹی کا ایسا براہِ راست لمس پورے عصری ادب میں کم دکھائی دے گا۔''
>
> (دستِ چنار از بلبل کاشمیری ص ۱۱)

''دستِ چنار'' میں بلبل کی تیس نظمیں شامل ہیں جن میں ''وطن میں آخری رات''، ''چناروں پر سلام''، ''اے وادی تجھ سے عہد میرا''، ''عارفِ کشمیر''، ''بانڈی پورہ''، ''پری

محل''، ''تراگہ بل''، ''اسی وادی میں''، ''پہلگام''، ''اودیس سے آنے والے بتا''، ''لمحوں کا سفر''، ''خلدِ بریں''، ''مریم سے''، ''انتظار''، ''دعا'' وغیرہ جیسی نظمیں ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ بلبلؔ کاشمیری گزشتہ چالیس سال سے غیر ممالک کی خاک چھان رہے ہیں لیکن یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ انھیں اپنے مادرِ وطن کشمیر کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ وہ ڈل اور ولر جیسے صاف و شفاف پانی سے بھرے ہوئے خوب صورت جھیلوں، شالیمار، نشاط، چشمہ شاہی اور اچھہ بل جیسے رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے باغات، گلمرگ، لولاب اور پہلگام جیسے صحت افزا مقامات اور سوپور، بانڈی پورہ اور چرار جیسی سیر گاہوں کو نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ جب بھی کبھی انھیں چنار، سفیدے، بادام اور صنوبر کے قطار در قطار درختوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے تو ان کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں اور اُن کے من کے اتھاہ ساگر سے بے شمار نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ لندن میں بیٹھ کر زعفران کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ انھیں بنفشی اور بادام کے جھنڈ دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بے خیالی میں بانڈی پورہ پہنچ جاتے ہیں اور مکان کی کھڑکی پر بیٹھ کر وہ برف کا نظارہ کرتے ہیں، جہاں انھوں نے بچپن کے بے فکر لمحات گزارے ہیں۔ بلبلؔ کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں تڑپ بھی ہے اور گداختگی بھی، بے قراری بھی ہے اور ملال بھی۔ مثلاً:

چشمہ شاہی کی بادِ صبح گاہی پر درود
تیکھی شاموں میں گاتے شاخساروں پر سلام

اچھہ بل یاد آ گیا اور پاپہ چھن یاد آ گیا
تھام لو مجھ کو مجھے اپنا وطن یاد آ گیا

کوہساروں پر نظر آتے ہیں جھرنا دل مجھے
لگ رہے ہیں عارضِ کشمیر کے آنچل مجھے

منتظر ہیں [illegible]

مضطرب ہے انجمن کی انجمن میرے لیے

دیکھئے اپنے دیہات بانڈی پورہ کی تصویر کس خوب صورتی سے کھینچتے ہیں:

وہ بانڈی پورہ جسے خود دستِ قدرت نے سنوارا ہے
وہ میرے پیار کا خط جو مجھ کو سب سے پیارا ہے
جو مسکن نازکی کا ہے جو حافظ کا بخارا ہے
میرے سینے پہ عمرِ رفتہ نے اِک تیر مارا ہے
اسی وادی نے یادوں کے جزیروں میں پکارا ہے

کشمیر کے دور افتادہ پہاڑی مقام پہلگام کے بارے میں بلبلؔ کے خیالات داد دینے کے لائق ہیں، کہتے ہیں:

دختر دوشیزہ کوہِ ہمالہ پہلگام
کھل گئے ہیں آسمانوں کے دریچے تیرے نام
سجتی ہے قامت پہ یہ رنگین قبائے سبز فام
اور سجی ہاتھوں میں یہ چھلکا ہوا فطرت کا جام

''دستِ چنار'' اپنے موضوع کے لحاظ سے بلبلؔ کاشمیری کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کشمیر اکیڈمی، مظفر آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ اِس کا تعارف ڈائریکٹر کشمیر اکیڈمی جناب جواد جعفری نے لکھا ہے۔ ۷۹ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں کشمیر کی رنگا رنگ اور خوشنما تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ افسوس ہے کہ اکیڈمی نے اس مجموعے کو شائع کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ اس طرح سے کتابت اور طباعت کی کمزوریاں جگہ جگہ راہ پا گئی ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل اگرچہ معنی خیز ہے لیکن کور معمولی کارڈ کا ہے جو اس خوب صورت شعری مجموعے کے شایانِ شان نہیں۔

(ماہنامہ شیرازہ سری نگر، جلد ۵۳، شمارہ ۱۰-۹)

محل''، ''تراگہ بل''، ''اسی وادی میں''، ''پہلگام''، ''او دیس سے آنے والے بتا''، ''لمحوں کا سفر''، ''خلدِ بریں''، ''مریم سے''، ''انتظار''، ''دعا'' وغیرہ جیسی نظمیں ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ بلبلؔ کاشمیری گزشتہ چالیس سال سے غیر ممالک کی خاک چھان رہے ہیں لیکن یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ انھیں اپنے مادرِ وطن کشمیر کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ وہ ڈل اور ولر جیسے صاف و شفاف پانی سے بھرے ہوئے خوب صورت جھیلوں، شالیمار، نشاط، چشمہ شاہی اور اچھہ بل جیسے رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے باغات، گلمرگ، لولاب اور پہلگام جیسے صحت افزا مقامات اور سوپور، بانڈی پورہ اور چرار جیسی سیر گاہوں کو نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ جب بھی کبھی انھیں چنار، سفیدے، بادام اور صنوبر کے قطار در قطار درختوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے تو ان کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں اور اُن کے من کے اتھاہ ساگر سے بے شمار نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ لندن میں بیٹھ کر زعفران کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ انھیں بنفشی اور بادام کے جھنڈ دکھائی دے رہے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بے خیالی میں بانڈی پورہ پہنچ جاتے ہیں اور مکان کی کھڑکی پر بیٹھ کر وہ برف کا نظارہ کرتے ہیں، جہاں انھوں نے بچپن کے بے فکر لمحات گزارے ہیں۔ بلبلؔ کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں تڑپ بھی ہے اور گداختگی بھی، بے قراری بھی ہے اور ملال بھی۔ مثلاً:

؎ چشمہ شاہی کی بادِ صبح گاہی پر درود
ملگجی شاموں میں گاتے شاخساروں پر سلام

؎ اچھ بل یاد آ گیا اور پاپہ چھن یاد آ گیا
تھام لو مجھ کو مجھے اپنا وطن یاد آ گیا

؎ کوہساروں پر نظر آتے ہیں جو بادل مجھے
لگ رہے ہیں عارضِ کشمیر کے آنچل مجھے

؎ منتظر ہیں نازکی، طاؤس چشتی سے رفیق
مضطرب ہے انجمن کی انجمن میرے لیے

دیکھئے اپنے دیہات بانڈی پورہ کی تصویر کس خوب صورتی سے کھینچتے ہیں:

وہ بانڈی پورہ جسے خود دستِ قدرت نے سنوارا ہے
وہ میرے پیار کا خط جو مجھ کو سب سے پیارا ہے
جو مسکن نازکی کا ہے جو حافظ کا بخارا ہے
میرے سینے پہ عمرِ رفتہ نے اِک تیر مارا ہے
اسی وادی نے یادوں کے جزیروں میں پکارا ہے

کشمیر کے دور افتادہ پہاڑی مقام پہلگام کے بارے میں بلبل کے خیالات داد دینے کے لائق ہیں، کہتے ہیں:

دختر دوشیزہ کوہِ ہمالہ پہلگام
کھل گئے ہیں آسمانوں کے دریچے تیرے نام
سجتی ہے قامت پہ یہ رنگین قبائے سبز فام
اور سخی ہاتھوں میں یہ چھلکا ہوا فطرت کا جام

''دستِ چنار'' اپنے موضوع کے لحاظ سے بلبل کاشمیری کا قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کشمیر اکیڈمی، مظفر آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ اِس کا تعارف ڈائریکٹر کشمیر اکیڈمی جناب جواد جعفری نے لکھا ہے۔ ۷۹ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے میں کشمیر کی رنگا رنگ اور خوشنما تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ افسوس ہے کہ اکیڈمی نے اس مجموعے کو شائع کرنے پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ اس طرح سے کتابت اور طباعت کی کمزوریاں جگہ جگہ راہ پا گئی ہیں۔ کتاب کا ٹائٹل اگرچہ معنی خیز ہے لیکن کور معمولی کارڈ کا ہے جو اس خوب صورت شعری مجموعے کے شایانِ شان نہیں۔

(ماہنامہ شیرازہ سری نگر، جلد ۵۳، شمارہ ۱۰-۹)

# فکر و فن

اکبر جے پوری

اکبر جے پوری وادیٔ کشمیر کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ کافی عرصہ سے شاعری میں اپنے دل کا درد انڈیلتے آئے ہیں اور غزل، نظم، مثنوی، قطعہ، رباعی، سلام وغیرہ مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اکبر جے پوری کے دو شعری مجموعے ''سازِ شکستہ'' اور ''فکر وخیال'' اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اور اب ''فکر وفن'' کے عنوان سے وہ اپنا ایک اور شعری مجموعہ پیش کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ آل انڈیا ہندی اُردو سنگم لکھنؤ کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل زیرِ بحث مجموعے میں ۷۷ غزلیں شامل ہیں۔ مجموعے کے آغاز میں جناب حیات وارثی اور خواجہ وجیہ الدین نے اکبر کی شخصیت اور اُن کی غزل گوئی پر روشنی ڈالی ہے۔

''فکر وفن'' کی غزلیں اکبر کے سابقہ مجموعوں کی غزلوں کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا توازن اور وقار پایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اکبر ایک رومانی شاعر ہیں۔ عشق ورومان کی کشاکش ابتدا سے ہی اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے اور وقت گزرنے کے بعد بھی اُس کی تمازت کم نہیں ہونے پائی۔ عشق دراصل اُن کے ہاں ایک علامت کا روپ اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ یہاں بھی وہی ہجر کا ملال، محبوب کا وصل اور عہد و پیماں کی

جھلکیاں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں لیکن اکبر نے زبان و بیان کی خوب صورتی سے ان غزلوں میں نیا رنگ بھر دیا ہے۔ اکبر عشق کے ساتھ ساتھ حُسن کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح سے جب عشق اور حُسن کا سنگم ہوتا ہے تو ان پر عجیب دیوانگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ تڑپ کر کہہ اُٹھتے ہیں:

؎ بازارِ محبت کی ہر رسم نرالی ہے — خنجر ہیں گراں جتنے سر اُتنے ہی سستے ہیں

؎ حُسن تم کو پسند عشق مجھے — اپنی اپنی نگاہ ہوتی ہے

؎ ہمارا ذکر بھی ہوگا یقیں ہے اکبر — لکھیں گے اہلِ قلم جب بھی عشق کی روداد

؎ ہے مکاں و زماں سے عشق آزاد — حُسن کی جلوہ گاہ ہوتی ہے

اکبر جے پوری کی غزلوں میں موجودہ دور کے انسان کا درد و کرب بھی اپنی ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود اس درد و کرب میں گرفتار ہیں۔ زمانے نے اُن پر کتنے ہی ظلم ڈھائے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر خودداری کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے ان مظالم کا ہنستے ہنستے مقابلہ کیا ہے اور اُن سے جو تجربات حاصل کیے ہیں، ان کو اپنی غزلوں میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

؎ ظلم و ستم کی داستان میری حیاتِ جاوداں
میری نوائے دل شکن پھیلی ہے کائنات میں

ایک اور جگہ پر اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ پوچھتے ہو حال اکبر کا — کیا کہیں دکھ بھرا افسانہ ہے

اس پس منظر میں چند اور شعر پیشِ خدمت ہیں:

؎ ازل میں کس کو خبر تھی یہ ہونے والا ہے
کہ جو بناتے ہیں ہم کو وہی مٹا دیں گے

؎ بے کسی پر میری اب تجھ کو بھی رحم آتا نہیں
اے اجل کیا تو بھی لذت آشنائے درد ہے

؎ پوچھنے آئے ہیں اب وہ مجھ سے میرا حالِ زار
جب نظامِ عالمِ ہستی بدل کر رہ گیا

اکبر جے پوری کی غزلوں میں حیات و کائنات کا حسین امتزاج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان غزلوں میں غمِ روزگار کے مسائل، سیاسی اور معاشی آشوب کی جھلکیاں اور موجودہ دور کے انسان کی بے چینی اور درد و کرب کا احساس جگہ جگہ اُبھرتا ہے۔ اکبر اپنے مادرِ وطن کشمیر سے والہانہ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ اپنے اشعار میں بار بار کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں اس کے کلچر، تہذیب و تمدن اور اس کے صحت مند اقدار کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً:

؎ ہے دُعا اے جنتِ کشمیر یہ تیرے لیے
تا ابد روشن رہے نیر تیری تقدیر کا

''فکر وفن'' اکبر جے پوری کی ایک منجھی ہوئی اور کامیاب کوشش ہے۔ کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔

# صبح، شفق، تلاوت

حکیم منظور

حکیم منظور ایک حساس اور درد مند رشاعر ہیں۔ وہ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل اُن کی پسندیدہ صنف ہے اور اس صنف میں اُن کے رنگارنگ خیالات اور جذبات ملتے ہیں۔ ''صبح، شفق، تلاوت'' اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ جو گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں معروف شاعر راج نرائن رازؔ، حکیم منظور کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حکیم منظور رواں صدی کی ساتویں دہائی میں اُردو کے شعری پس منظر پر نمایاں ہوئے۔ وہ جدیدیت کا دور تھا۔ تاہم حکیم منظور نے اپنی ایک الگ راہ نکالی، جو روایت سے لاتعلق بھی نہ تھی اور جدیدیت کی پیروکار بھی نہ تھی۔ منظور کی شاعری کی مثال پرزم (PRISM) جیسی ہے۔ عصری فکر واحساس کی ست رنگی چھوٹ پڑنے سے وہ مابعد عصر کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔''



''صبح، شفق، تلاوت'' کی شاعری اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ اس میں جہاں

؎ پوچھنے آئے ہیں اب وہ مجھ سے میرا حالِ زار
جب نظامِ عالمِ ہستی بدل کر رہ گیا

اکبر جے پوری کی غزلوں میں حیات و کائنات کا حسین امتزاج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان غزلوں میں غمِ روزگار کے مسائل، سیاسی اور معاشی آشوب کی جھلکیاں اور موجودہ دور کے انسان کی بے چینی اور درد و کرب کا احساس جگہ جگہ اُبھرتا ہے۔ اکبرا اپنے مادرِ وطن کشمیر سے والہانہ عشق رکھتے ہیں۔ اس کا ذکر وہ اپنے اشعار میں بار بار کرتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں اس کے کلچر، تہذیب و تمدن اور اس کے صحت مند اقدار کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً:

؎ ہے دُعا اے جنتِ کشمیر یہ تیرے لیے
تا ابد روشن رہے نیر تیری تقدیر کا

''فکروفن'' اکبر جے پوری کی ایک منجھی ہوئی اور کامیاب کوشش ہے۔ کاغذ اور طباعت کے اعتبار سے یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔

# صبح، شفق، تلاوت

حکیم منظور

حکیم منظور ایک حساس اور درد مند شاعر ہیں۔ وہ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل اُن کی پسندیدہ صنف ہے اور اس صنف میں اُن کے رنگا رنگ خیالات اور جذبات ملتے ہیں۔ ''صبح، شفق، تلاوت'' اُن کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ جو گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس مجموعے کے پیش لفظ میں معروف شاعر راج نرائن رازؔ، حکیم منظور کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حکیم منظور رواں صدی کی ساتویں دہائی میں اُردو کے شعری پس منظر پر نمایاں ہوئے۔ وہ جدیدیت کا دور تھا۔ تاہم حکیم منظور نے اپنی ایک الگ راہ نکالی، جو روایت سے لاتعلق بھی نہ تھی اور جدیدیت کی پیروکار بھی نہ تھی۔ منظور کی شاعری کی مثال پرزم (PRISM) جیسی ہے۔ عصری فکر و احساس کی ست رنگی چھوٹ پڑنے سے وہ مابعد عصر کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔''

''صبح، شفق، تلاوت'' کی شاعری اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ اس میں جہاں

ایک طرف فلسفیانہ بوباس ملتی ہے، وہاں دوسری طرف فکر ونظر کی بالیدگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک منظور کی غزلوں کا تعلق ہے اِن میں موجودہ دور کے انسان کا درد وکرب کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ اُن کے اس شعری مجموعے میں بعض ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں خود کلامی کا جذبہ بھی ہے اور ڈرامائیت بھی۔ ان غزلوں میں روح میں اُترنے والی طنز کی کاٹ بھی ہے اور جذبے کی شدت بھی۔ منظور کی غزلوں میں بعض ایسی خوبصورت تشبیہات واستعارات نظر آتے ہیں جو خالص کشمیری ہیں اور جن سے اس سرزمین کی خوشبو جا بجا ملتی ہے۔ وہ تازہ اور جاندار تراکیب اور علائم بروئے کار لانے کے قائل ہیں۔ اُن کا اسلوب سادہ ہے۔ اُن کے ہاں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے نرم اور ملائم الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ ''صبح، شفق، تلاوت'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں حقیقت بیانی بھی ہے اور اسلوب کی تازہ کاری بھی، جذبے کی شدت بھی اور اجتماعی فکر کا پرتو بھی۔ مثلاً

لوگو! لب کھولو، کچھ بولو، جہلم ہے مٹیالا کیوں
میں نے جب اس کو دیکھا تھا، یہ تھا اک آئینا سا

برف شگوفے جب کھلتے ہیں، اُس موسم میں آؤ تو
میرے خطوں کی خوشبوؤں کا ہوگا کچھ اندازا سا

گہری ہوئی ہیں اور بھی ڈل کی خموشیاں
جہلم پر جو رواں تھی وہ گفتار سوگئی

پتھر پہ اگر پھول سی آیات نہ لکھوں
پھر چپ ہی رہوں اور کوئی بات نہ لکھوں

سوچتا میں دھنک شناسا ہوں
آنکھ پر کیوں شفق سزا لکھتا!


''صبح، شفق، تلاوت'' میں مختصر بحور میں بھی چند غزلیں ملتی ہیں جن میں معنی و مفاہیم کا

سمندر پوشیدہ ہے۔ یہ بات اُن کی غزل گوئی کی ایک اور خصوصیت کی طرف اِشارہ کرتی ہے۔منظور کی غزلوں میں بھی سلاست اور پاکیزگی، حقیقت اور سادگی، لطافت اور شیرینی ملتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے مسائل اپنے بہترین الفاظ اور تراکیب میں قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہ سب اُن کی محنت، لگن اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ مشفق خواجہ، حکیم منظور کے اس شعری مجموعے پر اپنی رائے زنی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حکیم منظور نے اپنے گرد و پیش سے جو اخذ کیا ہے اُسے خوبصورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے اور اس طرح کہ جو بات بھی کہی ہے روشِ عام سے ہٹ کر کہی ہے اور جو لفظ بھی استعمال کیا ہے اسے نئی معنویت عطا کر دی ہے۔ مختصراً اس کی غزل سے ایک منفرد اور نئی جہت سامنے آئی ہے۔''

منظور کی غزلوں میں فنی چابکدستی اور لہجے کا تیکھا پن ملتا ہے۔ اُن کے حسیاتی محاکات کی انفرادی اہمیت ہے۔ اُن کی غزلوں میں پیکر تراشی کا عمل بھی ایک نئے طریقے سے اُبھرتا ہے۔ وہ بات کو گھما پھرا کر کہنے کے قائل نہیں بلکہ مختصر لفظوں میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے قائل ہیں۔ اُن کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں تجربے اور احساس کا اظہار بھی ہے اور جذبے کی حلاوت بھی، موسیقیت بھی اور فنکارانہ چابکدستی بھی، مثلاً

دریا بہا تو ساتھ میں پانی کو لے گیا — عنوان کیا دیا کہ کہانی کو لے گیا

پھر چپ ہی رہوں اور کوئی بات نہ لکھوں — پتھر میں اگر پھول سی آیات نہ لکھوں

اس سے بڑھ کر وہ اور کیا لکھتا — شعلہ پوشوں کو بے رِدا لکھتا

ہو ایک ایک بُوند شفق ساز میرا خواب — تازہ دھنک کے رقص کا آغاز میرا خواب

اس کے سوا، میرا کام ہے کیا؟ — حِنا سے لکھنا ہاتھوں پر

حکیم منظور کا شعری سفر جاری ہے۔ وہ کشمیری زبان میں بھی شعر کہتے ہیں اور اس زبان

میں بھی ایک بہت ہی دیدہ زیب مجموعہ پیش کر چکے ہیں۔ کشمیری اُن کی مادری زبان ہے، اِس لیے اُن کی کشمیری شاعری بھی روح کی پیاس بجھاتی ہے۔ ''صبح، شفق، تلاوت'' کا جہاں تک تعلق ہے، اِس میں جگہ جگہ فنی پختگی کا عنصر غالب ہے جو بقول زبیر رضوری ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے سے ذہن اور اعصاب پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتی ہے۔ حکیم منظور نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جموں میں گزارا ہے لیکن کچھ عرصے سے وہ کشمیر سے ہفتہ روزہ ''خبر ونظر'' شائع کرنے میں مصروف ہیں لیکن جموں کی یادیں اُن کے ذہن کے نہاں خانوں میں بسی ہوئی ہیں۔ جس کی شفاف تصویر ''صبح، شفق، تلاوت'' کے انتساب میں نظر آتی ہے۔ منظور نے اپنے اس شعری مجموعے کا انتساب نہ صرف جموں کی ادبی انجمنوں اور قلم کاروں کے نام کیا ہے بلکہ وہ اہلِ جموں کو بھی یاد کرتے ہیں جن کی پذیرائی سے اُن کا ادبی سفر خوشگوار بنا۔ اس شعری مجموعے کا سرورق دیدہ زیب ہے اور قیمت ۔/۲۰۰ روپے ہیں۔ مجموعے کا آغاز منظور نے اپنے اس شعر سے کیا ہے۔

لہو بنے گا فِدا تو منظوؔر شعر ہوگا
یہ ہاتھ آئے نہ خواہشوں سے نہ کاوشوں سے

مختصر یہ کہ حکیم منظور کا شعری مجموعہ اُن کے شائع کیے گئے سابقہ شعری مجموعوں کی طرح نہایت ہی بلیغ اور معنی خیز ہے، جس کو بار بار پڑھنے کے لیے طبیعت مائل ہوتی ہے۔

# بہتا پانی

## احمد وصی

''بہتا پانی'' احمد وصیؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں اُن کی منتخب نظمیں، غزلیں اور اشعار کے ساتھ ساتھ ایک آزاد غزل بھی تجربے کے طور پر ملتی ہے۔ ان میں سے چند غزلیں اور نظمیں گاہے گاہے ادبی رسائل کی زینت بن چکی ہیں اور اپنے آہنگ کی انفرادیت منوا چکی ہیں۔ عصرِ حاضر کے اکثر مجموعوں کی طرح ''بہتا پانی'' کے آغاز میں کسی صاحبِ نظر نقاد یا تبصرہ نگار کا دیباچہ یا تعارف شامل نہیں ہے۔ اس بات سے شاعر کی ذہانت، پختہ شعور اور بھرپور اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

> ''بہتا پانی میرا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کسی مستند یا مشہور اہلِ قلم کا لکھا ''پیش لفظ'' یا دیباچہ شامل نہیں ہے۔ اس بارے میں کسی طرح کی غلط فہمی نہ پیدا ہو، لہٰذا یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔''

''بہتا پانی'' کی نظمیں اور غزلیں اپنے اندر معنی و مفہوم کا ایک وسیع سمندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ان میں جہاں ایک طرف فلسفیانہ بو باس محسوس کی جاتی ہے، وہاں دوسری طرف تجربے کی انفرادیت اور فکر و نظر کی بالیدگی کا احساس بھی ہوتا ہے اگرچہ اُن کی چند تخلیقات

میں اُن کے پیش روشعراء کا پرتو بھی نظر آتا ہے لیکن پھر بھی یہ اپنی نزاکت اور جداگانہ اسلوبِ بیان سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ احمد وصؔی قاری کو اپنی شاعری کا مطالعہ کرنے کے لیے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنی تخلیقات پیش کر کے ان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور انھیں ان تخلیقات پر تنقید کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی مجموعے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں قاری کو پہلے سے اپنی شاعری کے بارے میں ذہنی طور پر تیار کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ یوں مجھے اپنی اُن تخلیقات کے لیے کچھ اور صفحات بھی مل گئے جو قاری کو میری شاعری کا پس منظر، اس کے محرکات اور نظریات سمجھنے میں اور مجموعی طور پر خود کسی نتیجے یا فیصلے تک پہنچانے میں مدد دیں گے۔''

احمد وصؔی کی نظموں میں خود کلامی کا جذبہ بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے مشورہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ذہن کے دریچوں پر دستک دے رہا ہے اور ان کو وا کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ایسی نظموں میں ایک آواز، ماضی، سُراغ، کلرک، کبھی، ردِّ عمل، تبدیلی وغیرہ ہیں۔ یہ نظمیں تجرباتی اعتبار سے کامیاب ہیں اور اس عہد کے درد و کرب کا احاطہ کرتی ہیں۔

احمد وصؔی کی غزلیں بھی رُوح کی پیاس بجھاتی ہیں۔ یہ غزلیں بھی دل و دماغ کو معطر کرتی ہیں۔ ان میں جہاں ایک طرف فلسفے کے ہلکے پھلکے نقوش سامنے آتے ہیں وہاں دوسری طرف نادر تشبیہات واستعارات کا انوکھا رنگ ملتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض تشبیہات و استعارات روایتی ہیں لیکن پھر بھی احمد وصؔی نے اپنے انوکھے انداز سے ان میں نئی فضا پیدا کی ہے۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ حسین تراکیب اور علائم کا ایک خوب صورت سنگم بھی احمد وصؔی کی شاعری میں ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ چاند جو راتوں کو مرے ساتھ چلا ہے

شاید مری تنہائی کا غم بانٹ رہا ہے

ہر چہرے پہ کھنچی ہوئی ہیں تھکن کی ریکھائیں
جیت کا ایک پل کھوج رہے ہیں ہارے ہارے لوگ

..................

ہاتھ مہندی کے پھولوں سے گلنار تھے
سبز تھیں پتیاں لہلہانے لگیں

..................

دن تو آواز کے صحرا میں گزرا لیکن
اب ہمیں فکر یہ ہے ختم کہاں رات کریں

احمد وصؔی اُردو شعراء کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک حساس اور دردمند شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز بچپن سے ہی کیا۔ چونکہ ان کے والد بزرگوار جناب زائرؔ سیتاپوری اپنے دور کے اچھے شعر کہنے والوں میں سے تھے اور اُن کے خاندان کے دیگر افراد بھی شعر و شاعری سے کافی شغف رکھتے تھے۔ اس لیے احمد وصؔی کو بچپن سے ہی زرخیز ماحول ملا اور انھوں نے بہت کم عمری سے ہی شعر کہنا شروع کیا۔ زندگی نے اُن کے والد سے وفا نہیں کی تو وصؔی اپنے چچا کی آغوش میں بمبئی پہنچ گئے۔ یہاں اُنھیں زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اسی لیے اُن کی شاعری آج کے انسان کے درد و کرب کا احاطہ کرتی ہے۔ شروع شروع میں احمد وصؔی نے کچھ مرثیے اور نوحے بھی لکھے لیکن بعد میں نظموں اور غزلوں کی طرف رجوع کیا اور جلد ہی اپنی پہچان منوالی۔ اُن سے قبل جدید شعراء کا ایک بڑا کاروان سامنے آیا تھا اور انھوں نے اپنے نئے تجربوں اور فکر و نظر کی گہرائی سے اُردو شاعری کے نمائندہ فن کاروں میں ایک خاص مقام بنایا تھا۔ احمد وصؔی اگرچہ اس کارواں میں کافی دیر کے بعد نمودار ہوئے لیکن انھیں اپنی منفرد آواز سے جلد ہی قبولِ عام حاصل ہوا۔

احمد وصؔی کا اسلوب نرالا ہے۔ وہ بھی اپنے اظہار کے لیے اپنے ہم عصر شعراء کی طرح میٹھے، نرم اور سبک الفاظ استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ یہ الفاظ اُن کی شاعری میں ایک نئی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ تہ داری اور معنویت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ پانی، بھیڑ، جنم،

ساگر، چاند، کرنیں، بدن، چاندنی، کنکر، ڈگر، جیون، تن، گھٹا، کانچ، یگ، پل، سانجھ، سمے، اتہاس، بھانت، باس، سونگھ، ساون، آنگن وغیرہ صرف چند الفاظ ہیں جن سے احمد وصیؔ کی شاعری میں حرکت وحرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھئے انھوں نے کس انداز سے ان الفاظ کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا ہے۔ مثلاً۔

عمر کی اُجلی ندی دن کی طرح ایسی چڑھی
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا اُجلا بدن

..................

میں پیاسی ریت ہوں اور تم گھرا ہوا بادل
خدا کے واسطے اِک بار تو برس جاؤ

..................

آتی ہے اتہاس سے ان کے بھانت بھانت کی باس
ہر مٹی کو سونگھ چکے ہیں یہ بنجارے لوگ

''بہتا پانی'' میں پیکر تراشی کے چند عمدہ نمونے بھی فراہم ہوتے ہیں جن سے صاف طور سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد وصیؔ کا ذہن بہت کُشادہ ہے اور وہ بات کہنے کا انوکھا انداز رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں اُن سے چُوک بھی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود وصیؔ کی شاعری میں تازگی اور توانائی، گہرائی اور گیرائی اور کیف وسرُور برقرار ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر اگر احمد وصیؔ کو ''بہتا پانی'' کا تنہا ساحل کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔

مجموعے کا گیٹ اپ قابلِ داد ہے۔ سرورق ڈاکٹر نیر مسعود نے بنایا ہے اور طباعت کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کے پیشِ نظر کتاب کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔

# اجنبی ہوا

ڈاکٹر شباب للت

شباب للتؔ اُردو کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ اُن کے اب تک ایک درجن کے قریب شعری مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ''اجنبی ہوا'' اُن کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس میں ان کی ۲۳ نظمیں، ۲۲ رباعیات، ۱۰ قطعات اور دوہے وغیرہ شامل ہیں جو رنگا رنگ موضوعات پر دال ہیں۔

شبابؔ کی شاعری میں ہماچل کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف فکر ونظر کی بالیدگی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف کیف وسرمستی اور تازگی وتوانائی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ شبابؔ ایک حساس فن کار ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں اپنے دل کا درد کاغذ پر انڈیلا ہے۔ جہاں تک ''اجنبی ہوا'' کا تعلق ہے، اس میں ایک انسان کا درد وکرب، اُس کی الجھنوں اور پریشانیوں کا کھل کر اظہار کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس شعری مجموعے کا آغاز نظموں سے کیا ہے۔ اِن نظموں سے شاعر کی دیدہ دلیری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ نظمیں شبابؔ کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی غماز ہیں اور جداگانہ کیفیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں ''تمنا آخری اپنی''، ''مبارک وہ دیش ہے''، ''اپنے مرکز کی طرف''، ''لمحۂ وصال''، ''بھرم''، ''تعلیم زدہ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

''نکتہ راز'' شباب کی ایک عمدہ نظم ہے۔ اس میں وہ تسخیرِ کائنات کا عزم کرتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ انھیں نقطۂ آغاز کا بھی احساس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ بلندی پر چلے جانے کے خواہاں ہیں انھیں پستی کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کو اپنی جڑوں سے رشتہ ہرگز نہیں توڑنا چاہئے بلکہ اُن کی جڑیں، اُن کے وجود کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ نظم علامتی ہے اور پڑھنے والے پر گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ ''شمشیر و سناں اوّل'' پڑھنے سے بھی کچھ ایسا ہی ردِعمل قاری کے دل و دماغ پر حاوی ہوتا ہے۔ اس نظم میں بھی انسان کا درد و کرب یہاں وہاں موہوم صورت میں دیکھنے میں آتا ہے۔ شباب کی نظم ''بھرم'' بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس میں خود کلامی کا عمل دخل ہے۔ یہاں بھی ذات کے کرب کا احساس ہوتا ہے۔

شباب کی نظمیں پیش کش، حُسن، کفایت شعار، ہم ناچیز اور منافق وغیرہ بڑی عمدہ اور جاندار نظمیں ہیں۔ اِن نظموں میں بھی احساس کی گرمی شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

خواتین کے لیے شباب کی نظمیں بھی غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ ان نظموں میں ''رحمتِ حق بیٹیاں''، ''ہاتھی کے دانت''، ''حسن کی کفایت شعار''، ''تعلیم زدہ'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شباب نے عورت کے مسائل، اُن کی تعلیم، اُن کے صبر و ایثار اور اُن کے بعض دوسرے مسائل کا نقشہ اپنے انوکھے انداز سے کھینچا ہے۔ ان نظموں میں اُن کا طنزیہ لب و لہجہ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ہاں بڑے چاؤ سے<br>
اِشتیاق و تمنا کے طوفاں بھرے<br>
جوش و ارماں بھرے<br>
چاہتوں سے چھلکتے دلوں نے<br>
خواتین کے سال کا خیر مقدم کیا تھا<br>
مبارک سلامت کے سیل نوا میں<br>
واقعی کیا خوش اقبال تھا

طالبؔ کی شاعری کو اور بھی وسعت عطا کرتے ہیں۔ مثلاً

میخانے کھلے ہر سُو، دھرتی پہ نشہ چھایا — خوشیوں کی بھری گگری آکاش نے چھلکائی

سرمئی اندھیرے میں چھپئی اُجالے میں — ہے خبر ہواؤں میں آپ آنے والے ہیں

کل رات میرے ساتھ ہوا بول رہی تھی — کچھ راز ترے کہنے کی پر تول رہی تھی

سحر قریب ہے ایک اور جام ہو جائے — فسانۂ شبِ ہجراں تمام ہو جائے

طالبؔ کی نظم ''عشق'' بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں اُنھوں نے عشق کی ماہئیت اور اس کی افادیت کا از سرِ نو جائزہ لیا ہے۔ وہ عشق کو آزار بھی کہتے ہیں اور تلوار بھی، اس کو آبِ حیات کا درجہ بھی دیتے ہیں اور راہِ نجات بھی تصور کرتے ہیں، عشق کو دھرم بھی کہتے ہیں اور ایمان سے بھی تعبیر کرتے ہیں، وہ عشق کو جامِ وفا کے نام سے بھی پکارتے ہیں اور اس کو نامِ خدا بھی کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق اُن کی شاعری کا ایک نمائندہ کردار ہے۔ اُن کے مطابق عشق کی گہرائی میں جا کر انسان اپنے خالق کو بھی پہچان سکتا ہے۔ یہی درس ساحرؔ لدھیانوی نے بھی اپنی نظم ''عشق'' میں دیا ہے۔ وہ عشق کو اپنی زندگی کا عزیز ترین سرمایہ کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبؔ کے جذبات ساحرؔ کی بلندیوں کو نہ چھو سکے لیکن اُن کی کوشش کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے۔ دیکھئے طالبؔ اپنی نظم ''عشق'' میں کیا کہتے ہیں:

عشق کی بات کہوں عشق ہوتا ہے جنوں — ایک دِلکش سا فسوں صبر اس میں نہ سکوں

عشق آزار بھی ہے، عشق تلوار بھی ہے

عشق ایمان میرا عشق قرآن مرا — بن گیا یارِ خدا عشق ہو تیرا بُرا

جذبۂ عشق کے تعلق سے طالبؔ کی ایک اور نظم توجہ طلب ہے۔ اس نظم کا عنوان اُنھوں نے ''عشق جیوتی سروپ'' رکھا ہے۔ اس میں طالبؔ حُسن اور عشق کا بڑے دلنشیں انداز سے موازنہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حُسن کے ساتھ ساتھ عشق بھی انسان کے لیے لازمی جزو ہے۔ وہ حُسن کو جلوۂ نور سے تعبیر کرتے ہیں اور عشق کو جذبۂ سرور کا نام دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق اگر حُسن رشکِ ماہ ہے تو عشق دہر پناہ کا درجہ رکھتا ہے۔ طالبؔ حُسن کو چڑھتی دھوپ سے تشبیہہ دیتے ہیں اور عشق اُن کے خیال میں جیوتی سروپ ہے۔ حُسن اور عشق کے اس خوب

صورت جذبے سے آپ بھی لطف اندوز ہو جائیے۔ کہتے ہیں:

ترا حُسن جلوۂ نور  میرا عشق جذبۂ نور
تیرا حُسن چڑھتی دھوپ  میرا عشق جیوتی سروپ
تیرا حُسن اک طوفان  مرا عشق ہے ایمان
ترا حُسن ساز آواز  مرا عشق گہرا راز
ترا حُسن رب کی شان  مرا عشق رب کی آن
ترا حُسن یکسر خاک  مرا عشق یکسر پاک
ترا حسن گیت کا سمان  میرا عشق گیتا گیان

طالبؔ شملوی کی نظموں میں طنز یہ پہلو بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اُن کے اس پہلو کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ کبھی زمانے پر طنز کرتے ہیں اور کبھی حکومت پر۔ کبھی سماجی ٹھیکے داروں کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں اور کبھی خود انسان کو ہی یہ بیماری پھیلانے کے لیے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ''ہائے مہنگائی'' اُن کی ایک نمائندہ نظم ہے، جس میں وہ آئے دن بڑھتی ہوئی مہنگائی کا رونا روتے ہیں اور ناجائز منافع خوری، رشوت ستانی، بدامنی اور بے کاری کا قلع قمع کرنے کے لیے فضا ساز گار کرنے کے متمنی ہیں۔

طالبؔ کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ اس میں کسی قسم کی ثقالت نہیں پائی جاتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا برمحل استعمال، فکر انگیز تراکیب اور خوب صورت علائم سے طالبؔ کی شاعری میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہی کیا کم اہم ہے۔

قریب سے دیکھا ہے۔ ہماچل کے پہاڑوں، گھنے جنگلوں، خوب صورت کھیتوں اور کھلیانوں، رنگ بدلتے ہوئے موسموں، پھولوں اور مرغزاروں، صاف وشفاف پانیوں اور تازہ اور خنک ہواؤں سے وہ زندگی بھر لطف اندوز ہوتے رہے۔ اسی لیے اُن کی نظموں میں ہماچل کا بھرپور حسن اُمڈ کے آیا ہے۔ شب کی دُلہن، یاد کی ٹھنڈی ہواؤ، سرمئی سانجھ کی بیلا، دردِ تنہائی، پھولوں والی، جب کبھی ساون مہینے، آمدِ فصلِ بہار، کہیں شام ڈھل نہ جائے وغیرہ صرف چند نظمیں ہیں جن میں فطرت کے کرشمے اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ دیکھیے اپنی نظم ''شب کی دُلہن'' میں کس طرح سے وہ تاروں بھری رات کے منظر کا سواگت کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| شب کی دُلہن ہے نور میں ملبوس | اوڑھنی پر ہے رقص تاروں کا |
| رونق افروز ہے جبیں پہ چاند | رنگ ہونٹوں پہ ہے بہاروں کا |
| ہر نفس قاصدِ نشاطِ نو | سایۂ وجد عنبریں زلفیں |
| مستیاں قید ہیں نگاہوں میں | حلقۂ عیش مرمریں باہیں |
| رُخ گلوں کے ہوانے چوم لئے | ایک جادو سا ہے فضاؤں میں |

طالبؔ زندگی کے شاعر ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے الفاظ کے دروبست سے نئے نئے رنگ بھرتے ہیں اور اس کو حیات آفریں بناتے ہیں۔ اُن کے خیالات میں جدت پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی خوابوں کی دنیا میں نہیں بھٹکتے ہیں بلکہ اپنے جذبات کو حقیقت کا لباس پہنا کر پیش کرنے کے روادار ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی نظمیں ''مچل جاؤں گا''، ''گلِ صحراوہ آگئے''، ''کل رات''، ''آنچل''، وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ طالبؔ کی بعض ایسی نظمیں ہیں جن میں زندگی کے حقائق کی بے شمار جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

طالبؔ کی شاعری کا ایک وقیع حصہ شراب کی سرمستیوں سے سرشار ہے۔ اُنھوں نے اس موضوع کو جس سلیقے سے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اُس کی داد نہ دینا کور ذوقی ہوگی۔ وہ کبھی ساقی سے شراب طلب کرتے ہیں اور کبھی اُس کو جام چھلکانے کے لیے اصرار کرتے ہیں، کبھی مے خانے کی جانب قدم بڑھاتے ہیں اور کبھی شراب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں۔ وہ تنہائی میں پینے سے لذت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک شراب، زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ وہ

اوروں کو بھی پینے کی تلقین کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق شراب پینے سے زندگی کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور انسان زمانے کی گردش سے آشنا ہو جاتا ہے۔ شراب پینے سے اُن پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ جگر اور عدمؔ جیسے شعراء سے مختلف ہے لیکن زندگی کے حقائق تک پہنچنا اُن کے ساتھ ساتھ طالبؔ کا بھی مرکزِ توجہ ہے۔ کہتے ہیں:

میرا جام بھر دے ساقی کہیں شام ڈھل نہ جائے
کہیں شام ڈھل نہ جائے یہ رُت بدل نہ جائے

میخانے کھلے ہر سُو، دھرتی پہ نشہ چھایا
خوشیوں کی بھری گگری آکاش نے چھلکائی

آج ساقی مجھے پی لینے دے
اپنی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں جی لینے دے

میکدے کھل گئے ہیں شمع روشن ہوئی ہے
سازِ مطرب نے چھیڑا بزم سجنے لگی ہے

طالبؔ کی بعض نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساحرؔ لدھیانوی اور قتیلؔ شفائی سے بے حد متاثر ہیں۔ اُن کی نظموں میں کہیں کہیں جاں نثارؔ اختر کی شاعری کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کے ہاں بعض ایسی تراکیب بھی نظر آتی ہیں جن سے صاف طور پر یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے اُن تمام شعراً کا مطالعہ سنجیدگی سے کیا ہے۔ اِس لیے اُن کی بعض نظموں میں جہاں ایک طرف ساحرؔ کا رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہاں دوسری طرف قتیلؔ کی شاعری کی خوشبو بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ طالبؔ کی نظمیں تیرا نام لے کر، آمد، کل رات، دردِ تنہائی اور عشق مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ طالبؔ نے اپنی شاعری میں جو تراکیب اور علائم استعمال کیے ہیں، اُن میں بھی قتیلؔ کی شاعری کی بُو باس ملتی ہے۔ ہندی آمیز زبان، جذبات کی آسودگی، تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال اور موضوعات کی رنگارنگی

# آ تیرے نینوں میں کاجل بھردوں

طالب شملوی

طالبؔ شملوی اپنی پیاری اور دلنواز شاعری کے لیے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔اُن کا اوّلین شعری مجموعہ ''لو پھر بہار آئی'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد چلو گنگا بلاتی ہے، بھجن امرت اور اندردھنش کے نام سے دیوناگری لپی میں اُن کے تین چھوٹے بڑے شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے۔''آ تیرے نینوں میں کاجل بھردوں'' طالبؔ کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے، جو ۶۵ مختصر اور طویل نظموں پر مشتمل ہے۔اُردو کے معروف شاعر ظہیر غازی پوری نے طالبؔ کے اس شعری مجموعے کا پیش لفظ لکھا ہے، وہ اُن کی نظم نگاری پر سیرِ حاصل تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''طالبؔ شملوی زندگی کی سرشاریوں کے شاعر ہیں اور متعلقاتِ زندگی کو اُنہوں نے سورنگ میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔وہ مثبت رویے کے شاعر ہیں اور اذیت کے عقب میں جھانکنے اور انبساط و مسرت کے کیف افزا سرور کی کشیدگی کرنے کے ہُنر سے آگاہ ہیں۔''

طالبؔ غزل کے شاعر ہیں اور نظم کے بھی۔انھوں نے گیت بھی لکھے ہیں اور ماہیے بھی، وہ

قطعات کہنے کا بھی اچھا سلیقہ رکھتے ہیں اور اُن کی آزاد نظمیں بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان تمام شعری اصناف پر وہ اچھی قدرت رکھتے ہیں۔ ''آ ترے نینوں میں کاجل بھر دوں'' اُن کی گونا گوں موضوعات پر لکھی گئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ خیالات کی پختگی اور جذبات کی لطافت سے سرشار ہے۔

طالبؔ اپنے خوب صورت الفاظ اور تراکیب سے ایک ایسے کردار کو حرکت اور حرارت بخشتے ہیں اور اُس کی آنکھوں سے گفتگو کرنے کی طاقت عطا کرتے ہیں، جو اُن کے فنکارانہ چابکدستی کی ایک مثال ہے۔ طالبؔ اپنے اس شعری مجموعے کا آغاز ''اے میرے مالک'' جیسی دُعائیہ نظم سے کرتے ہیں۔ وہ خدا سے رطب اللسان ہیں کہ دولت وشہرت کے بدلے اُنھیں صبر وقناعت اور تاج وحکومت کے بدلے مسرت وشادمانی عطا کریں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ دولت، شہرت، مال اور شان وشوکت ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ وہ خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ اُنھیں خدمتِ خلق کا جذبہ عطا کرے۔ اُنھیں معلوم ہے کہ جھوٹ اور فریب سے کام لینا اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے اور سچائی ہی دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

طالبؔ ''آ ترے نینوں میں کاجل بھر دوں'' کا انتساب اپنی پیاری ہمشیرہ جنت نشین سودیش جی کے نام منسوب کرتے ہیں۔ وہ اس میں اُس نیک اور بااخلاق خاتون کی جدوجہدِ حیات کا منظوم جائزہ پیش کرتے ہیں اور اُن کے مقصدِ حیات کو مرکزِ توجہ بناتے ہیں۔ وہ اُن کی ہمت، صبر اور استقلال کی داد دیتے ہیں، کہتے ہیں:

| | |
|---|---|
| ہو گیا بند دھڑکنوں کا ساز اور | خاموش ہوگئی آواز |
| نہ سُلجھ پائی موت کی گتھی | نہ سمجھ آیا زندگی کا راز |
| زندگی امتحاں رہی ہر دم تُو | رہی اک مجاہدِ جانباز |
| زندگی موت کا بیاں طالبؔ | راز تھا راز ہے رہے گا راز |

اس کے بعد رنگا رنگ موضوعات پر کہی گئی نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ طالبؔ کی نظموں کا ایک وسیع حصہ مناظرِ فطرت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہماچل جیسے خوب صورت علاقے میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے ہیں۔ اُنھوں نے فطرت کے حُسن کو

ماشا اللہ

(ہاتھی کے دانت)

؎ ہم نے دیکھا یہ ہمیشہ کروہی لوگ شباب
جن کی ہوتی ہیں وفاداریاں اپنی مشکوک
اپنے باطن کی خباثت کو
چھپانے کے لیے
اُنگلیاں اپنی اٹھاتے ہیں وفاداروں پر
اہلِ اخلاص ووفا سے
یہی ہوتا ہے سلوک

(منافق)

؎ شوہر کی آستین پہ بٹن ٹانکنا تو دور
ترکاری کاٹنے کا بھی سیکھا نہیں شعور
سمجھے نہ خانہ داری کے اس نے اگر امور
ماں باپ کا نہیں تو یہ کس کا ہے قصور
تعلیم کیا وہ جس میں نہ ہاتھوں کی مشق ہو
جس سے مٹے نہ تیرگی کس کام کا وہ نور

(تعلیم زدہ)

شبابؔ للت غزل میں بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں بھی اس دور کا آشوب پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ شبابؔ غزل کہنے کا ایک الگ اور انفرادی انداز رکھتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں داخلی کیفیات اور وارداتِ عشق کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُن کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہے۔ شبابؔ کی غزلوں میں چند عمدہ اور قابلِ قدر علائم بھی ملتی ہیں۔ تراکیب کی جدت اور تشبیہات واستعارات کے انوکھے پن نے اُن کی غزلوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ شبابؔ کی غزلوں میں نیا رنگ اور آہنگ ملتا ہے۔ ان میں

بھی موجودہ دور کے انسان کا درد و کرب اور اس کی بے راہ روی ملتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

ماں کی ممتا، باپ کی شفقت کا رکھ لیں کچھ لحاظ
آج کے لختِ جگر، نورِ نظر، دشوار ہے

میں وہ صحرا ہوں جسے پورا سمندر چاہئے
چند قطروں سے بجھاؤ گے مری تم پیاس کیا

کئی صدیوں سے ہم شہری ہیں لیکن
لہو میں اب بھی جنگل بولتا ہے

وہی منزل تھا وہی خود مرا رہبر نکلا
میں الگ سمجھا تھا جس کو مرے اندر نکلا

میرا مستقبل تو تیرے ہاتھ پر تحریر تھا
اور میں ڈھونڈ ا کیا ہوں اپنا مستقبل کہاں

شبابؔ کی غزلیں فکر انگیز ہیں۔ ان میں نئی نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا سادہ اور دلکش برتاؤ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے نرم و نازک الفاظ بھی ملتے ہیں۔ خوب صورت تراکیب اور بلیغ محاورات بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شاعر نے ان غزلوں میں چند اچھی اور خوب صورت علامتیں بھی پیش کی ہیں جن سے اُن کی غزلوں کی تازہ کاری میں اضافہ ہو گیا ہے۔ شبابؔ کا اسلوب نہایت ہی سادہ اور پاکیزہ ہے۔ بعض غزلیں بڑی مشکل اور پیچیدہ بحور میں ہیں لیکن ان میں بھی شاعر نے اپنی صلاحیت اور فن کارانہ چابکدستی سے وہ حُسن پیدا کیا ہے کہ قاری ایک عجیب آسودگی پاتا ہے۔ شبابؔ کی رباعیات اور قطعات بھی داد دینے کے لائق ہیں۔ اُن کے دوہوں میں بھی ایک خاص توازن ملتا ہے۔ مجموعی طور پر ''اجنبی ہوا'' ایک نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ گیٹ اپ دیدہ زیب، طباعت عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

(رسالہ رہنمائے تعلیم دہلی جلد ۹۳۔ شمارہ ۶ جون ۱۹۹۷ء)

غوث محمد غوثی کی غزلیں روایتی خیالات اور جدید فکری تقاضوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں جہاں ایک طرف پرانے اور روایتی خیالات ایک نئے اور انوکھے ڈھنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں وہاں دوسری طرف فکر کے نئے سانچے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔

لبِ فرات عجب شانِ سرفرازی تھی
گماں تھا، دشت میں نیزوں کے سر نکل آئے

وہ آندھیاں ہیں کہ سینے ہیں شق پہاڑوں کے
ترا کرم کہ ذرّوں کی ہے ہوا بستہ

دنیا کا بھرم قائم رکھنا، اوروں کے لیے جینا مرنا
اس دور کی وہ تہذیب نہیں اس دور کے وہ آداب نہیں

فرازِ دار ہو یا طورِ سینا
محبت تو بلندی چاہتی ہے

غوثی کی غزلیں فکر انگیز ہیں۔ ان میں نئی نئی تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا سادہ اور دل کش برتاؤ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ ان غزلوں میں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے نرم و نازک الفاظ بھی ملتے ہیں۔ خوب صورت تراکیب اور بلیغ محاورات بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شاعر نے ان غزلوں میں چند اچھی اور خوب صورت علائم سے بھی کام لیا ہے جن سے ان غزلوں کی تازہ کاری میں اضافہ ہوگیا ہے۔ غوثی کا اسلوب نہایت ہی سادہ اور پاکیزہ ہے۔ بعض غزلیں بڑی مشکل اور ٹیڑھی بحور میں ہیں لیکن اِن میں بھی شاعر نے اپنی صلاحیت اور فن کارانہ چابکدستی سے وہ حُسن پیدا کیا ہے کہ قاری ایک عجیب آسودگی پاتا ہے۔

مختصر یہ کہ غوثی کا یہ مجموعہ نہایت ہی فکر انگیز ہے اور بقول ڈاکٹر وحید اختر غوثی کی شاعری میں روایت کے احترام کے ساتھ نئے تجربوں کی آگاہی بھی ملتی ہے۔ اس مجموعے میں کچھ کمزور اشعار بھی ملتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ''عکسِ آئینہ'' ایک نئے زاویۂ نگاہ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ گیٹ اَپ دیدہ زیب اور طباعت عمدہ ہے۔ قیمت (۳۵/.. روپے) مناسب ہی ہے۔ یہ

مجموعہ فخر الدین علی احمد کمیٹی کے تعاون سے شائع ہوا ہے۔

(ماہنامہ شیرازہ جلد ۲۶ شمارہ ۳ مارچ ۱۹۸۷ء)

## برجستہ عابؔد مناوری

''برجستہ'' عابؔد کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک کا کلام شامل ہے۔ ''برجستہ'' کی غزلیں نہ ''بہارِ غزل'' کی غزلوں کے رنگ میں ہیں اور نہ ''شمیمِ گل'' کی۔ بلکہ ان کا اپنا ایک الگ رنگ اور خوشبو ہے۔ عابؔد نے اگرچہ روایتی شاعری سے شعر گوئی کا آغاز کیا لیکن ''برجستہ'' تک آتے آتے وہ تخلیق کے بہت سے مراحل سے گزر چکے ہیں۔ وہ جدید شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے وہی رنگ اور روش اپنائی جو اُن کے معاصرین اِختیار کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں بھی اُنھوں نے جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ ''برجستہ'' کی بعض غزلوں میں اگرچہ خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، بانؔی اور وزیر آغا کا رنگ بخوبی پہچانا جا سکتا ہے لیکن اُن کا اپنا الگ اور انفرادی رنگ تھا۔

''برجستہ'' کی غزلیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔ اس میں عابؔد نے زمانے کے درد و کرب کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں اُن کا لہجہ طنزیہ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے مخصوص لہجے اور دِلکشی سے یہ طنز لطیف احساس کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ''برجستہ'' میں عابؔد نئی صباحتوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان میں جہاں فکر و خیال کی بلندی ہے وہاں نغمگی اور لوچ برابر ملتی ہے۔ عابؔد جذبے کے شاعر ہیں۔ وہ ہر وقت نئے جذبات کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں اور نئے تقاضوں کو برتنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ خوشنما اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال اُن کی غزلوں کو نکھار بخشتا ہے۔

میرے آنگن میں بھی اے قوسِ قزح! اِک دن اُتر   زندگی میں تیرا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے

عابؔد ایک حقیقی شاعر تھے۔ اُن کی شاعری میں قوسِ قزح کی طرح بے شمار رنگ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہ الفاظ کی دروبست پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں علامت نگاری، پیکر تراشی اور تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ خوشنما تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اور یہی کیا کم اہم ہے۔



(ماہنامہ شیرازہ سری نگر جلد ۳۵۔شمارہ ۱۰۔۹)

پُر ملال پر بھی آنسو بہائے ہیں اوران کی گراں قدر ادبی خدمات کو یاد کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ''پتہ پتہ'' کی شاعری میں اگر چہ بادِ صبا کی نرمی پائی جاتی ہے لیکن اس میں کہیں کہیں خشک اور سنگلاخ زمیں میں بھی اشعار ملتے ہیں۔ ''پتہ پتہ'' کا گیٹ اَپ عمدہ، اس کی ترتیب مشتاق وانی نے انجام دی ہے۔ قیمت بہت ہی مناسب اور کاغذ عمدہ ہے۔

(ماہنامہ شیرازہ، سری نگر جلد۴۰ شمارہ۴۔۵ ۲۰۰۲ء)

## نظمِ بریں

اسعد بھدرواہی

ضلع ڈوڈہ سے تعلق رکھنے والے جن شعرا نے اپنی لازوال تخلیقات سے اُردو شاعری کے گلستان میں نئے رنگ بھر دیے۔ اُن میں کامگار کشتواڑی، رسا جاودانی، عشرت کاشمیری، نشاط کشتواڑی اور گونی بھدرواہی وغیرہ بڑی توجہ کے حامل ہیں۔ محمد اسد اللہ قاضی اسعد بھدرواہی کا نام بھی شعر وادب کے انہی خدمت گزاروں میں لیا جا سکتا ہے۔ اسعد مرحوم نے اگر چہ اپنی حیات میں اپنے کلام کی نشر واشاعت کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی لیکن یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ وہ مسلسل لکھتے رہے اور ادب کے خاموش پرستار بن کر اپنے خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے رہے۔

''نظمِ بریں'' اُن کے کلام کا انتخاب ہے۔ اِس میں غزل، نظم، نعت اور قطعات وغیرہ شامل ہیں جو قابلِ مطالعہ ہیں۔ ''نظمِ بریں'' کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب اسعد بھدرواہی ہر صنفِ شعر پر قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی غزل میں درد و کسک، نظم میں لوچ اور رس اور قطعات میں فکر انگیزی پائی جاتی ہے۔ اِس شعری انتخاب کا ایک بڑا حصّہ نظموں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں سرزمینِ بھدرواہ کی مٹی کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ خوشبو قاری کے دل و دماغ کو معطر کرتی ہے۔ اسعد بھدرواہی کی بعض نظمیں وطن پرستی اور قومی جذبے سے سرشار ہیں۔ ان نظموں میں بھی اُن کی شگفتگی جگہ جگہ ٹپکتی ہے۔ اسلوب کی تازہ کاری سے یہ نظمیں اور بھی جاندار بن گئی ہیں اور یہ سب بڑی بات ہے۔

# عکس آئینہ

## غوث محمد غوثی

غوث محمد غوثیؔ اُردو کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ انہیں غزل اور نظم پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ لیکن غزل اُن کی پسندیدہ صنف ہے اور یہی صنف اُن کے زیرِ تبصرہ شعری مجموعے ''عکس آئینہ'' میں ملتی ہے۔ مجموعہ کا آغاز حمد اور ایک نعت سے ہوتا ہے اور اختتام بھی نعتِ شریف پر ہی ہوتا ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ نعتوں اور حمد کے علاوہ ۶۳ غزلوں پر مشتمل ہے۔ احوالِ واقعی کے تحت شاعر اپنا تعارف کراتے ہیں۔ قاضی عبدالستار، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر بشیر بدر اور ڈاکٹر مظفر حنفی جیسے اہلِ قلم حضرات نے اپنی اپنی قیمتی آراء سے ''عکس آئینہ'' کے خالق کی تخلیقی کاوشوں کو سراہا ہے اور اُن کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔

غوث محمد غوثیؔ کافی عرصے سے شعر و شاعری کے وسیلے سے اپنا اظہار کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے استاد شہر جیلانی سے شعر و ادب کا درس لیا اور بہت ہی قلیل عرصہ میں اپنا ایک الگ اور منفرد لہجہ پیدا کیا۔ اس طرح سے وہ علی گڑھ کے تیسرے بڑے شاعر تصور کیے جانے لگے، جس کا اعتراف قاضی عبدالستار نے بھی کیا ہے۔ وہ مجموعے کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''جذبیؔ اور اختر انصاری (دہلوی) کے بعد علی گڑھ کے تیسرے بڑے شاعر کا نام غوثی ہے۔''

کیسے روشن کروں چراغِ وفا
نفرتوں کی ابھی ہوا ہے بہت

انجم کی شاعری میں طنز و مزاح کا پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے مطمئن نہیں۔ انھیں انسان کے مسائل اور اُن کی اُلجھن ہر دم تڑپاتی رہی ہے۔ وہ عوام میں پیدا ہونے والے جھگڑے، قتل و غارت اور آئے دن دنیا میں ہونے والی خوں ریزی دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ امن، شانتی، خاموشی، سکون اور محبت اُن کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ دنیا، سماج، اِنسان اور سوسایٹی پر طنز کرنے لگتے ہیں۔ حتٰی کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی کبھی نہیں بخشتے۔ دیکھئے وہ کس طرح اپنی بات منوانے کا شعور رکھتے ہیں۔ مثلاً:

دوستی، اُلفت، محبت، پیار، ہمدردی، خلوص
یہ سبھی اوصاف اب نایاب ہیں انسان میں

..................

ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والوں نے
بیچ میں یہ دیوار بنا ڈالی کیسی

..................

کیسے روشن کروں چراغِ وفا
نفرتوں کی ابھی ہوا ہے بہت

..................

لوگ سب اپنے گھروں میں قید ہیں
شہر میں کیسی چلی ڈر کی ہوا

..................

میں توانا کی جنگ میں جیت گیا لیکن
دنیا لگتی ہے خالی خالی کیسی

انجم کی غزلوں میں علائم اور پیکر تراشی کے نمونے بھی ملتے ہیں جن سے ان کے کلام میں تازہ کاری پیدا ہوگئی ہے۔ اُن کی غزلوں میں نئی نئی تراکیب ملتی ہیں۔ جو دل کو چھو لینے والی ہیں۔ ان سے جہاں ایک طرف نئے نئے معنی اور مفاہیم پیدا ہوتے ہیں وہاں دوسری طرف بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور جذبات اور احساسات کی لطافت بھی کم نہیں ہوتی ہے۔ وہ روایت کی پاسداری بھی رکھتے ہیں اور جدید دور کی پیچیدگیوں کا احساس بھی۔

آنند سروپ انجم کی شاعری میں ردیف اور قوافی کا استعمال انوکھا ملتا ہے۔ یہ ردیف اور قوافی ان کی غزلوں میں کئی نئے دروازے وا کرتے ہیں۔ اور معنی و مفاہیم کی نئی جہتیں سامنے لاتے ہیں۔ انجم کے ہاں مختصر بحور کا استعمال بھی اُنکی غزلوں کو لائقِ مطالعہ بنا دیتے ہیں۔ وہ ان مختصر بحور میں اپنے جذبات کو کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کی غزلیں پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ بعض غزلیں تو گیت کے فارم میں ہیں۔ بظاہر ان غزلوں میں سطحی خیالات پیش کیے گئے ہیں لیکن جو رنگ و آہنگ ان میں انجم نے اپنایا ہے وہ ضرور انوکھا ہے۔

''پتہ پتہ'' کی شاعری میں اور بھی خصوصیات دیکھنے میں آتی ہیں جن میں منظر کشی، مصوری، حقیقت بیانی اور جذبات نگاری قابلِ ذکر ہیں۔

انجم کے اس مجموعے میں چند نظمیں، قطعات اور دوہے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان نظموں میں ''وطن زندہ رہا''، ''اے وطن''، ''میری مقدس سرزمیں تجھ کو سلام''، ''یہ کیا ہو رہا ہے''، ''ڈاکٹر برج پریمی کی وفات پر'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نظمیں موضوعات کی رنگا رنگی پردال ہیں اور صدا بہار کیفیت رکھتی ہیں۔ نظموں کے اس حصّے میں دو مراثی بھی شامل ہیں۔ ''ماں کی وفات پر'' ایک ایسا مرثیہ ہے جو انجم نے اپنی والدہ کے انتقال پر لکھا ہے۔ اس میں وہ تمام جذبات سمٹ کر آئے ہیں جو ایک ماں کے بچھڑ جانے پر انسان محسوس کرتا ہے۔ انجم ماں کے تئیں اپنی عقیدت اور احترام پیش کرتے ہیں۔ ماں کی جدائی پر وہ چار چار آنسو رو رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غم کبھی نہ ختم ہونے والا غم ہے۔ اسی طرح انجم نے ڈاکٹر برج پریمی کے انتقالِ

# پتہ پتہ

## آنندسروپ انجم

ریاست جموں وکشمیر کے شعری اُفق پر چند ایسے نام بھی آتے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اُردو شعروادب میں اپنی شناخت منوائی۔ آنندسروپ انجم اگرچہ نئے شاعر ہیں لیکن وہ اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے اُردو شعروادب کی خدمات گزاری میں مصروف ہیں۔

انجم کا پہلا شعری مجموعہ ''راستے منزلیں'' ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ ''پتہ پتہ'' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۸ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں وہ نئے جوش اور ولولے کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس کے غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انجم سرسبز وشاداب جنگلوں، درختوں، جھرنوں اور پہاڑوں سے محبت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے ''پتہ پتہ'' کا استعارہ اپنے پورے شعری کائنات کا مرکز بنایا ہے جو نہایت ہی توجہ طلب اس لیے بھی ہے کہ اودھمپور جیسے غیرزرخیز اور بنجر علاقے میں رہ کر بھی انجم کا ذہن زرخیز رہا ہے۔ وہ مطالعے اور مشاہدے کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر شعری مجموعے کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس شخص کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ حیرت ہو جاتی ہے کہ وہ اودھمپور جیسے علاقے میں رہ کر بھی شعروادب کی شمع جلائے ہوئے ہیں اور

اچھے شعر کہتے ہیں۔

انجم ایک باصلاحیت شاعر ہیں۔ اس لیے انھیں موجودہ دور کے مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا بھرپور احساس ہے۔ یہ چیز اُن کے ایک اور نمایاں پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اُن کی شاعری میں آج کل کے انسان اور اس کے درد و کرب کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ انجم کی شاعری میں نئے اور تازہ فکری لہجے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا رچاؤ ملتا ہے۔ ان کے خیالات نرم، ملائم اور نازک ہیں۔ وہ جچے تلے انداز میں بات کو واضح کرنے کے قائل ہیں اور اس حال میں بھی بیان کی تازہ کاری برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں۔

دھوپ کی چادر بدن پر اوڑھ کر چلتے رہو
ریگزاروں کے سفر میں دور تک سایہ کہاں

..................

سادھو کی پہچان ہو کیسے
سب نے تن پر راکھ ملی ہے

..................

فصل اُگے گی کیسے انجم
کھیتوں کی جب کوکھ جلی ہے

..................

دکھائی پڑتا نہیں ہے کچھ بھی
یہ کیسی دیوار دھول کی ہے

..................

سوچ رہے ہیں جیون کا حاصل انجم
سر رکھ کر ہم یادوں کے سرہانے پر

# کلیاں

ہری مہتہ

ہری مہتہ ہندی ادب کے ایک باصلاحیت ڈراما نگار ہیں ۔ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں ۔ان میں سے بعض ڈرامے آل انڈیا ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج پر کھیلے جا چکے ہیں اور کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ۔ ہری مہتہ ایک ڈراما نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں ۔ ''کلیاں'' ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے ۔ جو ۱۹۸۱ء میں بہادر اردو اکادمی کی مالی امداد سے شایع ہو چکا ہے اور اسی اکادمی کی طرف سے شاعر کو گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا۔ شاعر نے کلیاں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کو مختلف عنوانات کے تحت قید کر دیا ہے۔ یہ چھے حصے ہیں :۔

۱۔ پیش لفظ

۲۔ جو نہیں آج تک سنا نہ سکا

۳۔ رباعی کہی حالِ دل کہہ لیا

۴۔ یہ غزلیں مری زندگی کی سنو

۵۔ یہ نظمیں ہیں نغموں کے ناز و نیاز

۶۔ اشعار

پیش لفظ میں اُردو کے نامور شاعر جناب رفعت سروش رقم طراز ہیں :۔

''ہری مہتہ کی شاعری ایک نا آسودہ روح اور ایک متجسس ذہن کی شاعری ہے ،مگر ان کے فکر کی پرواز محض اپنی ذات کے نہاں خانے کی طرف نہیں ہے بلکہ ان کے گرد وبیش کے ماحول اور خارجی دنیا کی طرف بھی ہے اور اسی رجحان نے انہیں ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔''

ہری مہتہ مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہیں ۔کلیاں میں ہر اصناف کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔''جو انہیں آج تک سنا نہ سکا'' کے عنوان کے تحت شاعر نے اپنی زندگی کے چند گوشے قارئین کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کے علاوہ اس میں انہوں نے اپنی شاعری کے محرکات کا بھی واضح طور پر ثبوت دے کر پڑھنے والوں کے لئے رکھا ہے۔

پیش لفظ اور شاعر کی خودنوشت رائے کے بعد ،رباعی کہی حال دل کہہ لیا' کے زیر عنوان مجموعے میں چند رباعیات نظر سے گذرتی ہیں ۔رباعی بہت ہی قدیم صنف سخن ہے ۔امیر خسرو سے لیکر آج تک متعدد شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنا لوہا منوایا ہے ۔ ہری بھی متعدد آوازوں میں سے ایک ایسی آواز ہیں جنھوں نے روایتی انداز سے رباعیات کہی ہیں لیکن اس میں بھی ایک دلگداز آواز پیدا کی ہے۔جدید دور میں جس طرح فراق گورکھپوری نے ''روپ'' اور جاں نثار اختر نے ''گھر آنگن'' کی رباعیات میں ایک نئی اور انفرادی آواز پیدا کی ہے ۔ ہری مہتہ اگرچہ ان کی تہہ تک نہ پہنچ سکے پھر بھی '' کلیاں'' میں چند رباعیات قابل توجہ ہیں ۔جو خیالیات کی رو سے جاندار اور روح پرور ہیں ۔ مثلاً

سمجھتا ہوں انسان ہے باشعور
ہے انسانیت اس کا مذہب ضرور
یہ اچھے برے کا ہے خود ذمے دار

ستاروں کا اس میں نہیں ہے قصور

..........................

مدہوش میرے جیسے تو آنکھوں سے ہو گئے
کچھ سو رہے تھے اور لگا اور سو گئے
میں تو غزل سنا کے اکیلا پڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے

..........................

تم میرے خیالات کا اک تاج محل ہو
تم نور کی برسات لئے حسن ازل ہو
جذبات کو نغمات کی لہروں میں اُتارو
تم رات میں گائی ہوئی غالب کی غزل ہو

..........................

کیا کبھی آپ نے یہ پوچھا ہے
کیوں ہری مر گئے کہ جیتے ہو

''کلیاں'' میں ہری مہتہ نے ''یہ غزلیں میری زندگی کی سنو'' عنوان کے تحت چند غزلیں بھی قلم بند کی ہیں ۔ ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہری مہتہ کا اصلی میدان غزل ہی ہے اگرچہ یہ صنف تصوف ، روحانیت ، عشق و عاشقی ، گل و بلبل اور ہجر وصال کی کیفیت سے بہت آگے بڑھ چکی ہے لیکن پھر بھی ہری کی غزلوں میں اس طرح کے خیالات و جذبات کی کمی نہیں ۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہری مہتہ نے میر ، غالب ، داغ ، اقبال کے ساتھ ساتھ فیض ، اختر شیرانی ، راشد ، احمد ندیم قاسمی ، فراق اور حفیظ جالندھری وغیرہ کے کلام کا بغور مطالعہ کیا ہے ۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں غم کی دھیمی دھمی آنچ ، حسن و عشق کا والہانہ پن ، غم روزگار کے مسائل بھی نظر آتے ہیں اور اس پر فرد کی محرومی ، تنہائی اور بے کسی کی رنگ

آمیزی بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اپنی زندگی میں ہری مہتہ کو دُنیا کے کم وبیش تمام ممالک کی سیر کا موقع ملا اور انہوں نے انسانی زندگی کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ ہری مہتہ اپنی ملازمت کے دوران ایک بین الاقوامی ادارے سے منسلک رہے۔ اس زمانے میں ملک ہندچین کے خوں نین حادثے سے دوچار ہوا تھا۔ اس جنگ کے دوران جوان سال عورتوں کی عصمتیں لٹ گئیں، بے شمار بچے بے گھر ہوگئے۔ ان گنت سپاہی شہید ہوگئے۔ اس سارے منظر کے نقوش ہری مہتہ کے دل ودماغ پر مرتسم ہوئے اور ان کی شاعری حسن وعشق کے ساتھ ساتھ دردوغم، یاس ومحرومی اور حسرت ومایوسی کا گنجینہ بن گئی۔ چند اشعار۔

آس کا جو چراغ روشن تھا     وہ بھی کب کا بجھا دیا میں نے

شاعری راس آگئی ہم کو     ورنہ ہنگامہ عمر بھر ہوتا

جب سے ہوئی ہری یہ محبت کی ابتدا
اس دن سے دیکھتے ہیں کہ برہم ہے کائنات

تارے جانتے ہیں گردشوں میں     زمیں پر کوئی ان کا ہم سفر ہے

کس کو دیں کس سے لیں کسے سمجھیں     ہر کوئی ہر طرف سوالی ہے

مری سادہ زندگی بھی بڑی مختصر کہانی
جو سنائی بن گئے ہیں کئی بے سبب فسانے

ان کے علاوہ ہری مہتہ کی غزلوں میں جو چیز توجہ طلب ہے وہ ہندستانیت ہے۔ وہ ہندستانی ہیں اور اس ملک کی عزت وآبرو کو اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں۔ اپنی غزلوں میں انہوں نے ہندوستانی تہواروں، پہاڑوں، پھولوں اور پھلوں، باغوں اور مرغزاروں پرندوں اور موسموں، کسانوں، مزدوروں اور شاعروں اور مصوروں وغیرہ کا جس خوبی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ وہ آپ اپنی مثال آپ ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:۔

آج آزاد ہو گیا مزدور
اس نے محنت کی روٹی کھائی ہے

ہری کی بات میں غالب کا رنگ ہو بھی اگر
ملا وہ وحشت آشفتہ سر کے کیا ہوگا

ظفر گئے تھے جہاں چل دیا وہاں یارو
ہری نے چھوڑ دیا ملک تاجداروں کا

وطن سے دور مجھے یوں لگا ہوائے وطن
ہمالیہ کی حسین وادیاں اٹھا لائی

اب غریبی ہٹا کے دم لیں گے
قسم ہندستان کی کھائی ہے

جہاں تک ہری مہتہ کی غزلوں میں زبان و بیان کا تعلق ہے وہ متاثر کن اور ولولہ انگیز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ کے اس میل جول سے ان کے کلام میں ولولہ جوش اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے اکثر جگہوں پر اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے الفاظ بھی خاطر میں لائے ہیں۔ اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے ان کی غزلوں میں سادگی، سلاست، کھلاوٹ اور مٹھاس پیدا ہوگئی ہے۔

ہری مہتہ کی نظمیں بھی ان کی غزلوں کی طرح جاندار اور روح پرور ہیں ان میں الفاظ کی جادوگری، خیالات کی فراوانی، لب ولہجہ کی رنگا رنگی، علامتوں اور استعاروں کی سحر کاری کے علاوہ ڈرامیت بھی ملتی ہے، ''کلیاں'' میں سب سے پہلی نظم ''کون'' اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ساری فضا کو پرکیف بنا دیتی ہے۔ مثلاً اس نظم میں سب سے پہلے دو کردار ابھرتے ہیں اور بعد میں ان کرداروں کیساتھ ساتھ اور بھی کئی کردار سامنے آجاتے ہیں اور خوبصورتی کے ساتھ اپنا رول نبھاتے ہیں۔ اس نظم کے ساتھ

ساتھ'' چاند کی رانی''، جوانی کے موڑ پر، غم ، یادیں ، کون ہے ہری تمہارا، بتا یہ کون لوگ ہیں ، وغیرہ جیسی نظمیں بھی خیالات کا ایک وسیع سمندر لئے ہوئے سامنے آجاتی ہیں اور قاری کے ذہن پر ایک اچھا تاثر چھوڑ دیتی ہیں ۔ رفعت سروش ، ہری مہتہ کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

> '' ہری مہتہ کا ذہن صرف روایت سے الجھا ہوا نہیں رہا ہے بلکہ انہوں نے روایت کا احترام باقی رکھتے ہوئے کئی راہیں بھی نکالی ہیں اور نئے شعری مجموعے بھی کئے ہیں ۔ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ڈراما نگار بھی ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو بھی ڈرامہ نگاری کے لئے صرف کیا ہے ۔''

چند نظموں کے اقتباسات پیش خدمت ہیں جن میں سادگی سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ ڈرامائی عناصر بھی اجاگر ہوتے ہیں مثلاً

میرے پیار کا ہندستان ہو — تم ہی میری نور جہاں ہو
تاریخ ، دلگیر میں دیکھا — خوابوں کی تعبیر میں دیکھا
دل میں یہ محسوس ہوا ہے — میں نے تم سے پیار کیا ہے

(تم ہی میری نور جہاں ہو)

اک دل چسپ داستان سن لو — اک حسینہ تھی مہرباں سن لو
لے لیا اس نے جو بھی لینا تھا — دے دیا اس نے جو بھی دینا تھا
پھر اچانک وہ میری جاں چل دی — ہو گئی ختم داستاں جلدی
ہو گئی پھر وہ بدگماں ایسے — لے لے گی وہ میری جاں جیسے

(مختصراً)

رنج پر رنج یوں نہیں آتے — [illegible] دل نہیں دُکھتا
آس کا آخری چراغ اکثر — ایک جھونکے سے یوں نہیں بجھتا

ایک جاں کو سجا کے ڈوبی میں — وہ جو دلہن بنا کے لائے تھے
جسم اک دن سجا کے کاندھوں پر — جا رہے تھے جہاں سے آئے تھے

(ماں)

''کلیاں'' کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہری مہتہ دورِ جدید کے ایک ایسے شاعر ہیں جو منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اگر وہ اسی محنت اور جگر کاوی سے اپنے خیالات قلم بند کرتے رہیں گے تو جلد ہی قارئین کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔

## ابرِ تر — فرید پربتی

فریؔد پربتی ایک نو آموز شاعر ہیں۔[1] اُن کی غزلیں حُسن اور تازگی سے معمور ہیں۔ اُن کی غزلوں میں وہی درد و کسک، فرد کی محرومی، موجودہ زمانے کا آشوب، تڑپ اور گداختگی پائی جاتی ہے۔ فریؔد غزل کے شاعر ہیں اس لیے اپنے رنگا رنگ خیالات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جدید غزل گو شعراء سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے روایتی شاعری سے کنارہ کشی اختیار کی۔

''ابرِ تر'' میں شامل غزلوں میں حُسن و عشق کا ایک دلفریب امتزاج ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محبوب کی اداؤں نے اُن کے دل کو داغ داغ بنا دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اختر شماری کرنے لگتے ہیں۔ فرد کی محرومی، موجودہ دور کا درد و کرب، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن ہونے والے مسائل اور اُن کی پیچیدگیاں فرید کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ پہلے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اُن کو تجربات کی سان پر چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہیں نہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا — نجانے لیکے کہاں مجھکو آ گئی ہے ہوا

فریؔد پربتی کی شاعری ابھی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی ہے لیکن اس میں جو تازگی اور توانائی ملتی ہے وہ ایک اچھے شاعر کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر فرید پربتی نے اب شعر و ادب میں اپنی پہچان منوالی ہے۔ ابرِ تر کے بعد اُن کے متعدد شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں آبِ نیساں، اثبات، فرید نامہ اور گفتگو چاند سے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُنھوں نے کشمیر کے ایک بزرگ شاعر شہہ زور (مرحوم) کا کلام بھی مُرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ (پ ر)

ساتھ'' چاند کی رانی'' جوانی کے موڑ پر' غم ، یادیں ، کون ہے ہری تمہارا ، بتا یہ کون لوگ ہیں ، وغیرہ جیسی نظمیں بھی خیالات کا ایک وسیع سمندر لئے ہوئے سامنے آجاتی ہیں اور قاری کے ذہن پر ایک اچھا تاثر چھوڑ دیتی ہیں ۔ رفعت سروش ، ہری مہتہ کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں :

'' ہری مہتہ کا ذہن صرف روایت سے الجھا ہوا نہیں رہا ہے بلکہ انہوں نے روایت کا احترام باقی رکھتے ہوئے کئی راہیں بھی نکالی ہیں اور نئے شعری مجموعے بھی کئے ہیں ۔ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ڈراما نگار بھی ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو بھی ڈرامہ نگاری کے لئے صرف کیا ہے ۔''

چند نظموں کے اقتباسات پیش خدمت ہیں جن میں سادگی سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ ڈرامائی عناصر بھی اجاگر ہوتے ہیں مثلاً

میرے پیار کا ہندستان ہو — تم ہی میری نور جہاں ہو
تاریخ ، دلگیر میں دیکھا — خوابوں کی تعبیر میں دیکھا
دل میں یہ محسوس ہوا ہے — میں نے تم سے پیار کیا ہے

(تم ہی میری نور جہاں ہو)

اک دل چسپ داستان سن لو — اک حسینہ تھی مہرباں سن لو
لے لیا اس نے جو بھی لینا تھا — دے دیا اس نے جو بھی دینا تھا
پھر اچانک وہ میری جاں چل دی — ہو گئی ختم داستاں جلدی
ہو گئی پھر وہ بدگماں ایسے — لے لے گی وہ میری جاں جیسے

(مختصراً)

رنج پر رنج یوں نہیں آتے — روز ہر روز دل نہیں دکھتا
آس کا آخری چراغ اکثر — ایک جھونکے سے یوں نہیں بجھتا

ایک جاں کو سجا کے ڈوبی میں　　وہ جو دلہن بنا کے لائے تھے
جسم اک دن سجا کے کاندھوں پر　　جا رہے تھے جہاں سے آئے تھے

(ماں)

''کلیاں'' کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہری مہتہ دور جدید کے ایک ایسے شاعر ہیں جو منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اگر وہ اسی محنت اور جگر کاوی سے اپنے خیالات قلم بند کرتے رہیں گے تو جلد ہی قارئین کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔

## ابرِ تر　فرید پربتی

فرید پربتی ایک نو آموز شاعر ہیں۔[1] اُن کی غزلیں حُسن اور تازگی سے معمور ہیں۔ اُن کی غزلوں میں وہی درد و کسک، فرد کی محرومی، موجودہ زمانے کا آشوب، تڑپ اور گداختگی پائی جاتی ہے۔ فرید غزل کے شاعر ہیں اس لیے اپنے رنگا رنگ خیالات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جدید غزل گو شعراء سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے روایتی شاعری سے کنارہ کشی اختیار کی۔

''ابرِ تر'' میں شامل غزلوں میں حُسن و عشق کا ایک دلفریب امتزاج ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ محبوب کی اداؤں نے اُن کے دل کو داغ داغ بنا دیا ہے اور اب وہ بے بس ہو کر اختر شماری کرنے لگتے ہیں۔ فرد کی محرومی، موجودہ دور کا درد و کرب، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور آئے دن ہونے والے مسائل اور اُن کی پیچیدگیاں فرید کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ پہلے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اُن کو تجربات کی سان پر چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہیں نہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا　　نجانے لیکے کہاں مجھکو آ گئی ہے ہوا

فرید پربتی کی شاعری ابھی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی ہے لیکن اس میں جو تازگی اور توانائی ملتی ہے وہ ایک اچھے شاعر کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر فرید پربتی نے اب شعر و ادب میں اپنی پہچان منوالی ہے۔ ابرِ تر کے بعد اُن کے متعدد شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں آبِ نیساں، اثبات، فرید نامہ اور گفتگو چاند سے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُنھوں نے کشمیر کے ایک بزرگ شاعر شہہ زور (مرحوم) کا کلام بھی مُرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ (پ ر)

# فکرِ ناتمام

## فدا کشتواڑی

عبدالرشید فداؔ کشتواڑی بالکل نئے شاعر نہیں بلکہ وہ ایک عرصے سے اپنے جذبات اور احساسات کاغذ پر انڈیلتے آئے ہیں اور اپنی دلنواز غزلوں اور نظموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر چہ وہ خطۂ جموں کے دُور اُفتادہ مقام کشتواڑ میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے ہیں لیکن اُن کا بیشتر وقت جموں میں گذر بسر ہوتا ہے، جہاں وہ مختلف علمی و ادبی تقاریب میں حصّہ لیا کرتے ہیں اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔ ''فکرِ ناتمام'' اُن کی اوّلین شعری پیشکش ہے، جو ۲۰۰۳ء میں اُردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی کشتواڑ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ فداؔ نے اس مجموعے کا انتساب اُن تمام حضرات کے نام لکھا ہے جو اپنے خونِ جگر سے اُردو زبان وادب کی آبیاری کرتے رہے یا اب بھی اس گنگا جمنی زبان کو ترقی وفروغ دینے میں اپنا حصّہ ادا کرتے ہیں۔ اُن کے اس انتساب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُردو زبان وادب سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔

فداؔ نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تحقیقی مقالات بھی، وہ کشمیری شعر وادب کے مزاج سے بھی آشنا ہیں اور اُنہوں نے اولیائے کشتواڑ کے بارے میں ایک دِلچسپ تذکرہ بھی لکھا ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً جگن ناتھ آزادؔ، محمد یوسف ٹینگ، منظر اعظمی، ظہور الدین، حکیم منظور، میکش کاشمیری،

عشرتؔ کاشمیری، رسا جاودانی اور عرش صہبائی وغیرہ سے فیض حاصل کرتے رہے۔ غالبؔ، اقبالؔ، حالیؔ، اور چکبستؔ اُن کے پسندیدہ شعرأ میں سے ہیں، اسی لیے اُن کی شاعری میں ان تمام اساتذۂ فن کے اثرات موہوم صورت میں یہاں وہاں نظر آتے ہیں۔ ولی محمد اسیرؔ کشتواڑی اپنی کتاب ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت'' میں فداؔ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فدا کشتواڑی کی شاعری میں روایت اور جدت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اُن کی اُردو شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنہوں نے قدیم اور جدید اساتذہ سخن کا بہت سارا کلام پڑھا ہے، جس کے اثرات کلامِ فدا میں دیکھے جاسکتے ہیں۔''

اُردو شاعری میں فداؔ باطنی رشتہ رکھتے ہیں۔ غزل، نظم، رباعیات اور قطعات کے علاوہ اُن کی نعتیہ شاعری بھی مطالعے کے قابل ہے۔

''فکرِ ناتمام'' کو فداؔ نے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں ۷۳ غزلیں شامل ہیں اور دوسرا حصّہ ۲۹ نظموں پر مشتمل ہے۔ ''فکرِ ناتمام'' کے اِن دونوں حصّوں میں فداؔ اپنے مخصوص انداز میں سامنے آتے ہیں۔

فداؔ نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو اُس زمانے میں کشتواڑ میں عشرتؔ کاشمیری، نشاط کشتواڑی، جانبازؔ کشتواڑی اور غلام رسول کامگار کی شاعری کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ ان آوازوں نے اپنے مخصوص لہجے سے کشتواڑ کی فضاؤں سے نکل کر نہ صرف ریاست گیر مقبولیت حاصل کی تھی بلکہ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی اُنہوں نے اپنی پہچان منوائی تھی۔ فداؔ کے دل و دماغ پر بھی اُن آوازوں نے اپنے اثرات منقش کیے اور اُن کے دل سے شعر پھوٹنے لگے۔ اس بات کی طرف خود ''فکرِ ناتمام'' میں اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''میرے ادبی اور شعری ذوق کو پروان چڑھانے میں جناب عشرت کاشمیری کا ہاتھ رہا ہے۔ جناب عشرت کاشمیری مشاعروں میں مجھ سے اپنی غزلیں پڑھواتے تھے کیونکہ اُن کو ترنم

سے پڑھنا بہت پسند تھا۔ اس طرح اُن کا کلام پڑھتے پڑھتے
ایک وقت ایسا آیا کہ میں خود بھی اُردو اور کشمیری میں ٹوٹے
پھوٹے شعر کہنے لگا اور مجھے مشاعروں میں خوب داد ملنے لگی۔''

فدؔا کی غزلوں میں جہاں ایک طرف حُسن وعشق کی تب وتاب ملتی ہے وہاں ان میں دردو کسک کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ یہ وہ درد ہے جو ایک عاشق کو اندر ہی اندر کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ فدؔا عشق کی لذت سے آشنا ہیں اور وہ حُسن کی نزاکت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ عشق اور حُسن کی یہ ملی جلی کیفیت اُن کی بیشتر غزلوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ فدؔا کی بعض غزلوں میں روایتی عشق کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن اُنہوں نے اپنے شعور کی بالیدگی اور اپنے تجربے کی وسعت سے اپنی غزلوں میں تازگی اور توانائی پیدا کی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں:

؎ اُس عشق نے رسوا ہم کو کیا الزام کسی پہ لگائیں کیا
جب اپنے ہی دشمن بن جائیں غیروں کی بات سنائیں کیا
وہ میری انا کو کیا سمجھیں وہ میری وفا کو کیا جانیں
اک بار منایا تھا اُن کو اب پھر سے اُن کو منائیں کیا
ہم رسمِ وفا کے دیوانے آدابِ وفا سے واقف ہیں
جو ہم سے نفرت کرتے ہیں ہم اُن سے ہاتھ ملائیں کیا

اس سلسلے میں ایک اور غزل پیش کرتا ہوں۔

عشق خانہ خراب جیسا ہے حُسن پھر بے حجاب جیسا ہے
روز غیروں سے آکے ملتا ہے میری خاطر وہ خواب جیسا ہے
اُس کو دیکھوں کہ میں پڑھوں اُس کو
اس کا کا چہرہ کتاب جیسا ہے

فدؔا غم کے شاعر ہیں۔ اسی لیے اُن کی غزلوں میں غم، مایوسی، لاچاری، بے بسی اور بے چہرگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ غم کچھ تو اُن کے ذاتی غم ہیں اور کچھ اُنہیں زمانے کی بے رُخی سے

ملے ہیں۔ ان دونوں طرح کے غموں کو وہ اپنے اندر جذب کر چکے ہیں۔ اسی لیے اُنہوں نے اپنے عہد کا کرب اپنے اشعار میں سمیٹ لیا ہے اور لوگوں کے ذاتی کرب کے ساتھ ساتھ اپنے تجربات کا بھی محاکمہ کیا ہے۔ لیکن اُنہوں نے کبھی حرفِ شکایت نوکِ زبان پر نہیں لائی بلکہ اپنے غموں کو مسکراتے ہوئے سہہ لیا ہے۔ کہتے ہیں:

؎ روز خونِ جگر میں پیتا ہوں  روز و شب ہے یہ کاروبار مجھے

؎ آپ سے دل بھی کیا لگانا تھا  جب غموں سے ہی دوستانہ تھا

؎ بچ گئے ہم خُدا کی قدرت ہے  وار اُن کا تو قاتلانہ تھا

؎ میں تو پہلے ہی زخم خوردہ ہوں  آج ہی تم کو آزمانا تھا

؎ مدت ہوئی کہ تم سے رہا فاصلہ مجھے  لیکن متاعِ غم نے دیا حوصلہ مجھے

؎ زخم ہی زخم ملتے رہے دوستو  کس طرح یہ طبیعت بہل جائے گی

فدؔا کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انسان دوستی اور امن و آشتی کا پیغام مِلتا ہے۔ عام طور پر اس طرح کے خیالات نظموں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن فدؔا کی غزلیں ہر طرح کے خیالات جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ فسادات ہوں یا ناگہانی آفت، ملک دشمن عنصروں پر کڑی نظر رکھنی ہو یا انسانیت کو پامال کرنے کی سازش، بجلیاں گرانے کا منظر ہو یا لوگوں میں پھیلی ہوئی بدامنی، فدؔا کا قلم رواں دواں چلنے لگتا ہے۔ وہ امن کے پجاری ہیں اور خاموشی سے زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں کسی کو تکلیف میں دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ وہ نفرتوں کے چراغ گل کرنا چاہتے ہیں اور ایک نئی بہار کی آمد کے متمنّی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

؎ انسان ہی کر رہا ہے انسانیت کا خون
افسوس کوئی دہر میں انساں نہیں رہا

؎ توڑ کر نفرت کی دیواریں تمام  داستانِ دل سنانے آ گئے

؎ ملک وملت کے نام پر اب بھی قتل انسانیت کا جاری ہے

؎ نفرتوں کے چراغ گل کردو آرزو یہ فدؔا ہماری ہے

؎ کس طرح انسانیت پامال ہوتی ہے یہاں
کس طرح سے خونِ انساں کا بہا لیتے ہیں لوگ

فدؔا اگرچہ روایتی شاعر نہیں لیکن اُن کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ ضرور ملتا ہے۔ وہ جدید شاعری سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں۔ اُن کے ہاں پُرانے موضوعات کے ساتھ ساتھ نئے خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ بے مقصد خیالات اور فرسودہ موضوعات کو اپنی غزل میں جگہ دینے کے قایل نہیں بلکہ شاعری کی تمام لوازمات کو بروئے کار لا کر اپنے جذبات کو موثر ڈھنگ سے پیش کرنے کے روداد ہیں۔ اُن کی غزلوں میں خواب، شہر، آئینہ، چہرہ، پتھر، دریا، موج، حادثہ، منزل، قطرہ، قافلہ، راستہ، خوشبو اور سمندر وغیرہ جیسے الفاظ کے استعمال سے ایک نیا رنگ وآہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ اگرچہ اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں پُرانے اور دقیق خیالات بھی ملتے ہیں لیکن فدؔا ان الفاظ کو ایسے معنی عطا کرتے ہیں کہ خیالات کا زیروبم دیر تک کانوں میں گونجتا رہتا ہے۔ مثلاً:

؎ حسین خواب تھا جو مجھ کو خواب دے کے گیا
وہ میرا دوست تھا لیکن عذاب دے کے گیا

؎ جانے کس کا ہے انتظار مجھے کون کرتا ہے بے قرار مجھے

؎ جب کبھی اس چمن میں بہار آئے گی ہر کلی پھول بن کر مچل جائے گی

؎ چاہتوں کا بھرم سدا رکھنا آندھیوں میں دیا جلا رکھنا

؎ دِل محبت کا خزینہ ہے دِل کے زخموں کو تم ہرا رکھنا

اس طرح کے بے شمار اشعار ذکرِ ناتمام میں ملتے ہیں۔

''فکرِ ناتمام'' میں چند نظمیں بھی نظر نواز ہوتی ہیں۔ جن کے مطالعے سے اُسی درد و کرب اور اسی شدت کا احساس ہوتا ہے جو فدؔا کی غزلوں میں رچ بس گیا ہے۔ ''پھر یاد کوئی آج آیا ہے''، ''ایک چڑیا''، ''میرا سایہ'' اور ''بے گناہی کی سزا ہو جیسے'' اُن کی چند یادگار نظمیں ہیں، جن میں خیالات کی فراوانی ملتی ہے۔ اِن نظموں میں تازہ فکر و خیال کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور سادگی اور سلاست بھی۔ فدؔا کے موضوعات اپنے گرد و نواح اور روزمرہ زندگی کے حادثات و تجربات پر محیط ہیں۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں عشقیہ موضوعات کا بھی احاطہ کیا ہے اور سیاسی، انقلابی اور نیچرل موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور اس طرح سے خواطر خواہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ فدؔا پابند نظموں کے بھی دلدادہ ہیں اور آزاد نظموں کے وسیلے سے بھی اپنے قلم کو زبان دیتے ہیں۔ اُن کی پابند نظموں میں ایک خاص قسم کا آہنگ ملتا ہے۔ وہ آسان اور سلیس زبان میں بات کہنے کے قائل ہیں۔ لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود اُن کی نظمیں اُن کی غزلوں کے ہم پایۂ نہیں رکھی جا سکتی۔

''فکرِ ناتمام'' ۱۵۰ صفحات پر مشتمل فدؔا کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی کمپوزنگ اُردو بک ریویو، نئی دہلی نے کی ہے۔ ساحل احمد اور رہبر جدید نے اس شعری مجموعے کے آغاز میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور علمی و ادبی دُنیا میں فدا کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ ''فکرِ ناتمام'' کا سرورق دیدہ زیب ہے اور قیمت مناسب۔

# خواب جزیرے

ڈاکٹر رفیق انجم

پونچھ بھی ریاست جموں و کشمیر کے مختلف اضلاع کی طرح شعر و ادب کے لحاظ سے بڑا مردم خیز رہا ہے۔ یہ ضلع اگرچہ ریاست کے دُور افتادہ علاقوں کے زمرے میں آتا ہے لیکن سیاسی، سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں میں ریاست کے کسی دوسرے علاقے سے کم تر درجہ نہیں رکھتا ہے۔ شعر و ادب کے میدان میں چراغ حسن حسرت، کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، دینا ناتھ رفیق وغیرہ کے نام سے کون واقف نہیں جنھوں نے اپنے ادبی کارناموں سے تاریخِ ادب میں بلند مقام پیدا کیا۔ اس خوب صورت علاقے کی فضاؤں سے اُوپندر ناتھ اشک بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور کشمیری لال ذاکر نے بھی اپنے بچپن کا خاصا حصّہ پونچھ کی سرسبز اور شاداب وادیوں میں گزارا، جہاں اُن کے والد محکمہ ٹورازِم سے وابستہ رہے۔[1] اس طرح سے ریاست جموں و کشمیر کا یہ حصّہ شروع سے ہی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے بعد بیسیوں قلم کاروں نے اپنے بزرگوں کی اس شاندار روایت کو برقرار رکھا اور اپنے خونِ جگر سے شعر و ادب کے گلستان کی آبیاری کی۔ رفیق انجم پونچھ کے ایک گوجر نژاد شاعر ہیں۔ اُنھوں نے پونچھ کی ادبی روایت پر گامزن ہونا اپنا اوّلین فرض سمجھا اور شعر کا میڈیم اختیار کیا۔ اُن

---

[1] ڈاکٹر برج پریمی: جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما ص ۱۸۹

کے اشعار میں پہاڑوں پر بسنے والے لوگوں کی طوفانی زندگی کا عکس مِلتا ہے۔

''خواب جزیرے'' اُن کا اوّلین شعری مجموعہ ہے جو اُنھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کی ورق گردانی کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انجم بچپن سے ہی شعر و ادب سے دِلچسپی رکھتے ہیں۔ ''خواب جزیرے'' میں اُن کا دس سالہ شعری انتخاب شامل ہے۔ انجم پیشے سے ڈاکٹر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُردو شعر و ادب سے کافی شغف رکھتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ زیرِ بحث مجموعے میں اُن کی غزلیں شامل ہیں۔ بعض غزلیات نہایت ہی فکر انگیز اور قابلِ مطالعہ ہیں۔

رفیق انجم نے اپنی شاعری کا آغاز عشقیہ شاعری سے کیا۔ اس لیے اُن کی اکثر غزلوں پر عشقیہ رنگ ہی غالب ہے۔ لیکن اُن کا عشق روایتی عشق سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس میں وہی آگ، تڑپ اور گداختگی مِلتی ہے جو روایتی کلاسیکی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن وہ اپنے خیالات کو الفاظ کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں کہ خود بخود معنی کی پرتیں کھل جاتی ہیں اور وہ نئے انداز سے عشق کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عشق کے میدان میں اُنھوں نے بڑے مصائب جھیلے ہیں لیکن کبھی شکست نہیں کھائی بلکہ دشوار گذار راستوں سے گزر کر مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین مجموعے کے پیش لفظ میں بجا طور پر لکھتے ہیں:

> ''خواب جزیرے رفیق انجم کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے اور چونکہ وہ اس وقت عمر کی اُس منزل سے گزر رہے ہیں جسے عرفِ عام میں عہدِ شباب قرار دیا جاتا ہے۔ اِس لئے اس مجموعے میں شامل اُن کی غزلوں کے موضوعات بھی اکثر و بیشتر وہی ہیں جنہیں عمر کے اس دور سے فطری مناسبت ہے۔''

اس ضمن میں چند اشعار پیشِ خدمت ہیں جن میں وصل کی لذت بھی ہے اور ہجر کا ملال بھی، عاشق کی خود سپردگی بھی اور محبوب کی ادائیں بھی، کہتے ہیں۔

تم نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
عکس مِٹ جائیں گے سارے آئینہ رہ جائے گا

میری ہر یاد کو سینے سے لگانے والے
تو کہاں ہے میرے خوابوں کو سجانے والے

تیرے پیار میں ہم نے اپنا
کیا حال بنا رکھا ہے

غم کو سینے سے لگایا ہے، لگا رکھیں گے
کھونے دیں گے نہ کبھی یہ نشانی تیری

رفیق انجم حقیقت پسند شاعر ہیں۔ وہ زیادہ دیر خوابوں میں رہنے والے نہیں بلکہ اُنھیں حقیقی دنیا کا بھی احساس ہے۔ وہ اس دور کے حالات و واقعات کی بخوبی جانکاری رکھتے ہیں۔ اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے نبض شناس ہیں۔ اپنے پیشے کے اعتبار سے اُن کی انگلیاں نہ صرف مریضوں کے نبض پر رہتی ہیں بلکہ زمانے کے اُتار و چڑھاؤ پر بھی اُن کی نگاہ اکثر رہتی ہے اور یہ سب سے بڑی بات ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں جن میں موجودہ دور کا درد و کرب سمٹ کر آیا ہے۔

پہلے رستے کا جنہیں پتھر کہا
اب وہ منزل کا نشاں ہونے لگے

دیوانہ ہوں آندھی میں بھی
ایک چراغ جلا رکھا ہے

پاس گئے احساس ہوا
وہ بھی کتنا تنہا تھا

میرا دعویٰ ہے پائے گا یہیں بکھرے ہوئے موتی
کوئی تاریک گلیوں میں کبھی جو روشنی بھر دے

رفیق درد و کرب، مصائب و پریشانی کا اپنی شاعری میں کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ کہیں

کہیں وہ بکھرنے بھی لگتے ہیں اور کہیں آس لگائے بیٹھے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی وہ دنیا کی ہنگامہ آرائی پر سوچنے لگتے ہیں اور کبھی اُن کے دل میں کائنات کا تصّور جاگ اُٹھتا ہے تو وہ اُس پر غور کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کے گھروندے پر آسمان ٹوٹ پڑتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا آشیانہ بجلی گرنے سے خاکستر ہو گیا ہے۔ لیکن اس حال میں بھی اُن کے ہوش وحواس قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں۔

وہ گھروندا جس پر ٹوٹا آسماں، میرا ہی تھا
بجلیاں جس پر گریں وہ آشیاں میرا ہی تھا

مجھے تو نت نئی تخلیق سے بہتر لگے یارب
انہی افسردہ چہروں میں ذرا سی تازگی بھر دے

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

ہیں لاکھ تلخیاں پھر بھی حسین ہے
نہ ہوا بیزار انسان زندگی سے

رفیق انجم کے ان اشعار میں تسلسل اور اعتدال ہے۔ اُن کی بعض غزلیں قابلِ مطالعہ ہیں۔ اِن میں شدت بھی ہے اور تازگی بھی، شیرینی بھی ہے اور نغمگی بھی۔ وہ دور از کار تراکیب استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے بلکہ اپنے جذبات کو سیدھے اور صاف انداز میں بیان کرنے کے قائل ہیں۔ چند اشعار۔

تیرے پیار میں ہم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے
پاس گئے احساس ہوا، وہ بھی کتنا تنہا تھا

تیری سکھیاں بھی شوخی سے یقیناً پوچھتی ہونگی
یہ کِس نے خط میں تجھ کو اس قدر بے باکیاں لکھدیں

کبھی تاریکیوں سے بھی نئی راہیں نِکلتی ہیں
کبھی انکار سے اُمید کی کرنیں برستی ہیں

رفیق انجم کی بعض غزلوں میں گیت کی لوچ ملتی ہے۔ اِن میں بھی میٹھا میٹھا درد اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ہندی اور اُردو کی آمیزش سے ان گیت نما غزلوں میں رس اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ رفیق نے اِن غزلوں میں مختصر بحور کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہاں بھی وہ وارداتِ قلب بیان کرتے ہیں اور اپنے جذبات کو صداقت اور سچائی سے کاغذ پر انڈیلنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے، کہتے ہیں۔

دل کی کھڑکی کھولو تو　　سارے موسم اچھے ہیں
کیسے بھولے بھالے ہو　　خواب کی باتیں کرتے ہو
تیری یادوں نے سینے میں　　اک کہرام مچا رکھا ہے

رفیق کی زبان صاف اور بیان دلکش ہے۔ وہ بوجھل تراکیب استعمال نہیں کرتے اور نہ قاری کو پُر پیچ جذبات سے گمراہ کرتے ہیں۔ بعض ایسے اشعار ہیں جن میں قاری معنی کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ کہیں کہیں اُن کے ہاں مصرعوں کا ربط بھی ٹوٹ جاتا ہے اور مفہوم واضح طور پر سامنے نہیں آتا۔

انجم ابھی نوجوان ہیں۔ اُن میں کافی صلاحیت ہے۔ اگر وہ اسی لگن اور دیانتداری سے تخلیقی کام کرتے رہے تو ریاست کے غزل گو شعراء میں جلد ہی اپنا مقام بنائیں گے۔

# آئینہ آس کا

آس بھدرواہی

ضلع ڈوڈہ کے شعری اُفق پر بعض اہم شخصیات کے ساتھ ساتھ چند ایسے نام بھی سامنے آتے ہیں، جنہوں نے ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی تخلیقات سے نئے رنگ بھر دیے، لیکن زندگی کے کاروبار میں اُلجھنے کی وجہ سے اُن کے ادب کو پھلنے پھولنے اور پنپنے کا موقعہ نہیں ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُنہوں نے جو کچھ بھی وقتاً فوقتاً ضبطِ تحریر میں لایا، وہ طاقِ نسیاں بن کے رہ گیا۔ اس طرح سے شعروادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود بھی وہ گوشۂ گمنامی میں رہ گئے۔ آس بھدرواہی کا نام ایسے ہی باصلاحیت قلم کاروں میں لیا جا سکتا ہے جو محکمہ زراعت میں ایک اعلیٰ آفسر ہونے کے باوجود ہی شعروادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں اور تادمِ تحریر اپنے خیالات کی پختگی اور ذہن کی بالیدگی سے اس کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔

آس ایک باصلاحیت شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اپنی دفتری مصروفیات کے باوجود بھی شعروادب سے اپنا رشتہ بنائے رکھا اور اس میں ایسے رنگ بھر دیے کہ اُن کی صلاحتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ''آئینہ آس کا'' صوفی عبدالقیوم بٹ آس کا اوّلین شعری مجموعہ ہے جس میں اُن کا ۱۹۶۷ء سے ۲۰۰۲ء تک کے کلام کا انتخاب ملتا ہے جو لگ بھگ ۳۵ سال پر محیط ہے۔ ''آئینہ آس کا'' تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ حالانکہ آس نے اس مجموعے کی ترتیب میں کوئی خانہ بندی نہیں کی ہے۔ اس

کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ آزاد فضاؤں میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اس شعری مجموعے کو حقیقی معنوں میں اپنا آئینہ بنا دیا ہے۔ ''آئینہ آس کا'' کا پہلا حصّہ نعتیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصّہ آسؔ نے اپنی غزلوں کے لیے وقف رکھا ہے اور اس مجموعے کے تیسرے حصّے میں اُن کی نظمیں ملتی ہیں۔ اِس طرح سے یہ ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ایک بہت ہی خوبصورت گلدستہ بن گیا ہے۔

آسؔ نے جب شعروشاعری کا آغاز کیا تو اُس زمانے میں سرزمینِ بھدرواہ میں نہ صرف بعض اہم آوازیں گونج رہی تھیں بلکہ اُنھوں نے ملک گیر شہرت بھی اختیار کی تھی۔ رسّاؔ، عشرتؔ، کامگارؔ، نشاطؔ، گونی، مرغوبؔ اور جانبازؔ صرف چند نام ہیں، جنھوں نے اپنی سدا بہار نظموں سے اُردو اور کشمیری کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں ایک خاص مقام بنایا ہے۔ آسؔ نے بھی ان اساتذہ کی صحبت میں رہ کر تربیت پائی اور اس طرح سے اُن کو ایک صحت مند ادبی فضا میسر ہوئی۔ بزمِ ادب بھدرواہ کا بنیادی اور سرگرم رُکن ہونے کی وجہ سے اُن کی شاعری کے تیور کُھل گئے۔ اسی دور میں اُنھیں اس بزم کے سربراہ تنویر بھدروائی کا ہم جلس ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس طرح سے ان کی شاعری میں روز بہ روز نکھار آتا گیا۔ وہ تجربات اور مشاہدات کے سفر پر رواں دواں ہوئے اور اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر اُتارتے رہے۔

میرے اِس بیان کی تصدیق ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی ''آئینہ آس کا'' کے سرنامے میں یوں کرتے ہیں:

> ''آسؔ اقبال بزمِ ادب بھدرواہ کے بنیادی اور سرگرم رکن ہیں۔ اُنھیں بزم کے سرپرست جناب محمد الیاس ملک تنویر بھدروائی جیسے پختہ کلام شاعر کا ہم جلس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ آسؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جِلا بخشنے میں اُن کا کافی حصہ ہے۔''

''آئینہ آس کا'' کا پہلا حصّہ نعتیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ یہ نعتیں اگرچہ تعداد میں کم ہیں

لیکن ان میں فنکاری کے جوہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ آسؔ اکثر خدا کے حضور میں سر بہ سجود ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے لیے ہی دعا مانگتے ہیں بلکہ عالمِ انسانیت کا دامن خوشیوں سے بھرنے کے بھی خواہاں ہیں۔ عاجزی، انکساری، بندگی اور خاکساری آسؔ کی ان نعتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ آسؔ اپنے الفاظ کے دروبست سے اپنی نعتیہ شاعری میں خوشبو بکھیر دیتے ہیں اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ منوّر کرنے کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ آسان اور عام فہم زبان نے آسؔ کی اِن نعتوں میں جہاں ایک طرف معنی آفرینی کی ہے وہاں دوسری طرف اُن کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ مثلاً:

| | |
|---|---|
| ؎ تو غنی ہے ہم فقیرِ بے نوا | کون دینے والا ہے تیرے سوا |
| ؎ ہم پہ فرما اپنی رحمت کا نزول | ٹوٹی پھوٹی یہ دعائیں کر قبول |
| ؎ محمدؐ نام پیارا ہے | اُسی کا بس سہارا ہے |
| ؎ ملا اُس کو کنارا ہے | تجھے جس نے پکارا ہے |
| ؎ نہ پہچانا اگر اُن کو | خسارا ہی خسارا ہے |
| ؎ دِل و جان ہو کہ مال و زر | مرا سب کچھ تمہارا ہے |

..............................................

| | |
|---|---|
| ؎ محمد کے در پہ میں کیا جا رہا ہوں | کہ دردِ جگر کی دوا پا رہا ہوں |
| ؎ قدم بڑھ رہے ہیں مدینے کی جانب | خوشی سے میں گویا اُڑا جا رہا ہوں |

..............................................

| | |
|---|---|
| ؎ مدینے کی عظمت ہی حضرت سے ہے | یہ تحفہ ملا اس کو قدرت سے ہے |
| مدینہ کے ہیں خوب بازار گلیاں | مدینہ میں ہر دِل کی کھلتی ہیں کلیاں |
| یہاں درس ملتا ہے وحدانیت کا | محبت اخوت کا انسانیت کا |

''آئینہ آس کا'' کا ایک بڑا حصّہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ کرنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ آسؔ کلاسیکی غزل کے مزاج سے آشنا ہیں۔ غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کے اثرات اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں بخوبی پہچانے جا سکتے ہیں۔ مقامی رنگ اور ذاتی تجربات اُن کی غزل کا خاص جوہر ہے۔

آسؔ کے ہاں عشق کی کارفرمائی بھی ملتی ہے اور حُسن کی نزاکتیں بھی۔ حُسن و عشق کے اِس اِمتزاج نے اُن کی غزلوں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ وہ ان غزلوں میں اپنے محبوب کی اداؤں کا بار بار ذکر کرتے ہیں اور اُن کی جفاؤں سے اپنا دامن بھرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ذرا سی جنبش سے جب اُن کا محبوب اُن سے ناراض ہوتا ہے تو وہ تِلملا اُٹھتے ہیں اور اُس کا تعاقب کرنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں:

؎ محبت میں جدائی کا یہ عالم — تڑپتا میں اِدھر ہوں وہ اُدھر ہے

؎ لیے ہاتھوں میں وہ تلوار نظر آتے ہیں — دشمنِ جاں میرے غم خوار نظر آتے ہیں

؎ ہم پہ کیا کیا جفائیں تو نے کئیں — ہم تو تیری قسم نہیں بدلے

؎ وہ ستم اب بھی توڑتے ہیں آسؔ — ہیں وفا کیش ہم، نہیں بدلے

؎ عشق کے میدان میں میرے سامنے — قیس یا فرہاد کی کیا بات ہے

؎ کہوں کیا آس الفت کی بدولت — ترا کس شہر میں چرچا نہیں ہے

آسؔ کی غزلوں میں طنزیہ لب و لہجہ بھی ملتا ہے۔ وہ نہ صرف سوسائٹی پر طنز کرتے ہیں بلکہ موجودہ انسان کو بھی طنز و تضحیک کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری حق تلفی، بدامنی، چور بازاری، رشوت خوری اور ناانصافی کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ وہ صاف ستھرا نظام دیکھنے کے متمنی ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر میں جو تجربات حاصل کیے ہیں اس کی ایک بھرپور جھلک اُن کے اشعار میں ملتی ہے۔ کہتے ہیں:

؎ وہ کفن چور ہیں بیٹھے ہیں جو ایوانوں میں — یوں تو غربا کے وہ غمخوار نظر آتے ہیں

؎ نمازیں پڑھیں اور رشوت بھی لیں — نہ غرقِ ندامت نہ دِل شرمسار

؎ یہ اعمال ہی کی سزا تو نہیں — کہ عزت کا دامن ہوا تار تار

؎ رشتے ناطے بھول جاتے ہیں سبھی — کیا کہیں کیا نشہ ہے اقتدار

؎ واعظ چلا حرم سے جب میکدے کی جانب — چھپ چھپ کے عاشقی کی پڑھتا کتاب آیا

آسؔ کی غزلوں میں جہاں ایک طرف عصری آگہی کا عرفان ملتا ہے وہاں وہ دوسری طرف پرانے اور قدیم تجربات سے بھی آگہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے جس سلیقے سے پُرانے تجربات کو الفاظ کے نئے لباس میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ اسی لیے اُن کے فن میں جگہ جگہ معصومیت ٹپکتی ہے۔ اور یہ معصومیت اُن کی شخصیت کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اُن کی کئی غزلیں مختصر اور چھوٹی زمینوں میں بھی ملتی ہیں جن میں اُنہوں نے اپنے عمر بھر کے تجربات کی عکاسی بڑے سلیقے سے کی ہے۔ آسؔ کی اس طرح کی غزلوں میں گیت کی لے آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

؎ گھر میں تنہا باہر تنہا — سب کو دیکھا تنہا تنہا

؎ شہر میں سب تھے کھوئے کھوئے — میں بھی رویا تنہا تنہا

............................................................

؎ غمِ الفت سے ساز باز کریں — اپنی ہستی کو بے نیاز کریں

؎ اُن کی نیت کا کیا بھروسہ آسؔ — جو رقیبوں سے ساز باز کریں

؎ خامشی سے کام لے — معرفت کا جام لے

؎ بخش دیتا ہے اُسے — جو بھی اُس کا نام لے

؎ صبر کا میٹھا ہے پھل — صبر سے تو کام لے

............................................................

؎ تو بھی کم زباں بن — صاحبِ قرآں بن

تُو اگر انسان ہے انسان رہ انسان بن

صبر وسلوک سے کام لے صاحبِ ایمان بن

''آئینہ آس کا'' میں آسؔ کی غزلوں اور اُن کے نعتیہ کلام کے ساتھ ساتھ دو نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آس کو سرزمینِ بھدرواہ سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ بچپن کے مقدس ایام کی یاد کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے بے فکر لمحات میں برف گرنے کا نظارا کرتے تھے۔ وہ عرصہ سے جموں میں قیام کرنے کے باوجود بھی اپنے پاس بھدرواہ کی مٹی کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ بھدرواہ کے کلچر، تہذیب اور تمدن کے ہلکے ہلکے نقوش اُن کی نظموں میں یہاں وہاں موہوم صورت میں نظر آتے ہیں۔ اور یہی کیا کم اہم ہے۔

''آئینہ آس کا''، صوفی عبدالقیوم بٹ آسؔ کا دیدہ زیب شعری انتخاب ہے لیکن مجھے اس شعری انتخاب کا نام زیادہ معنی خیز نہیں لگا۔

انتخاب میں شامل صفحہ نمبر ۶۲ پر جو غزل نظر آتی ہے۔ اس کے ردیف قافیے پر دوبارہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس شعری انتخاب میں انتساب کے فوراً بعد آسؔ اظہارِ تشکر کی طرف آتے ہیں۔ اس میں وہ اُن دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے ذریں مشوروں سے یہ شعری انتخاب شائع ہوا ہے۔ اگر شاعر اس جگہ پر اپنے شعری تجربات کے بارے میں روشنی ڈالتے اور اظہارِ تشکر کے لیے مجموعے کے آخری صفحے کا انتخاب کرتے تو زیادہ مناسب رہتا۔

بہرحال آسؔ کا یہ شعری انتخاب قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کا ڈسٹ کور دیدہ زیب ہے۔ لیکن کس پریس سے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے، کتاب میں اس کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ ''آئینہ آس کا'' کی قیمت ۔/۱۵۰ روپے ہے جو اس گراں بازاری کے دور میں مناسب ہے۔

☆ پریمی رومانی کے اسلوب میں ایک خاص قسم کی شگفتگی ہے' جو اس لیے بھی تعجب خیز ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ اُن کا قدم خوب سے خوب تر کی جانب اُٹھ رہا ہے۔ اگر وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے اور اپنے مخصوص میدانِ تنقید یعنی جدید اُردو شاعری سے باہر نہ بھٹکے تو یقیناً کچھ عرصہ کے بعد اُردو ادب میں اُن کی آواز غور سے سُنی جائے گی۔

(پروفیسر مسعود حسین خان' علی گڑھ)

☆ ڈاکٹر پریمی رومانی ادھر نئے لکھنے والوں میں خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جدید اُردو شاعری، چند مطالعے، اوراق، ردِّ عمل، تاثرات، برج پریمی۔ ایک مطالعہ نیز شاعری میں سنگِ میل اور ان کے علاوہ کشمیری میں دو کتابیں۔ اُنہوں نے تحقیق و تنقید دونوں سمت توجہ دی ہے اور دونوں کا حق ادا کیا ہے......... ڈاکٹر پریمی رومانی کے مطالعے کی وسعت اور شعر و ادب کے مختلف گوشوں پر اُن کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

(پروفیسر سلیماں اطہر جاوید (حیدرآباد)

ماہنامہ سب رس' حیدرآباد اگست ۲۰۰۳ء)